واقعاتِ سیرتِ نبوی میں توقیتی تضاد اور اس کا حل

از

جناب مولوی اسحٰق النبی صاحب علوی، رامپور

فاضل مقالہ نگار ایک گوشہ نشین وخاموش مگر بلند پایہ صاحبِ علم وتحقیق ہیں، عرصہ ہوا جب موصوف کا ایک مقالہ "حضرت ہارون اور گوسالہ پرستی" کے عنوان سے برھان میں شائع ہوا تھا، جس کا علمی حلقوں میں بڑا چرچا ہوا اور مولانا گیلانی نے اسے پڑھ کر لکھا تھا کہ "یہ ایک مضمون ہی برہان کی بقائے دوام کا ضامن ہے" آج موصوف ہماری بار بار کی درخواست پر پھر برہان کی بزم میں آرہے ہیں، اس مقالہ کو پڑھ کر ارباب علم ونظر محسوس کریں گے کہ یہ بلند پایہ تحقیقی مقالہ پوری تاریخِ اسلام میں ایک بالکل نئی مگر نہایت اہم اور بنیادی بحث پر مشتمل ہے جسے فاضل موصوف نے بڑی خوبی اور کامیابی کے ساتھ سر انجام دیا ہے۔ (ایڈیٹر)

انسانی تاریخ میں ساتویں صدی عیسوی ہمیشہ یادگار رہے گی، کیونکہ اس زمانے میں دنیا ایک عجیب وغریب انقلابی تحریک سے روشناس ہوئی تھی، جس کے ایک ہی ہاتھ میں بیک وقت تخریب وتعمیر دونوں کے جوہر موجود تھے، عرفِ عام میں اس تحریک کو اسلامی تحریک کہا جاتا ہے، اس کی ابتدا، اگرچہ جزیرہ نمائے عرب کے ایک گمنام اور غیر تاریخی گوشے یعنی حجاز سے ہوئی تھی، لیکن اس کی عمومی اور آناً فاناً مقبولیت نے ثابت کردیا کہ یہ وقت کی آواز تھی، جو کہیں سے بھی اٹھتی ضرور سنی جاتی، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بیس پچیس سال کے اندر ہی یہ

تحریک پورے مشرقِ وسطیٰ پر چھا گئی، جہاں سے اس کا ہدف پورا عالم تھا۔

یہ بات سب کو تسلیم ہے کہ "جزیرہ نما" سے نکلنے کے فوراً ہی بعد اس تحریک کے علمبرداروں نے ایک ایسی بے نظیر تہذیب، اور لاثانی تمدن کی بنیاد ڈالی تھی جس نے انسانیت کو آگے بڑھانے میں حیرت خیز کام انجام دیئے، اور جو آج بھی تاریخ تمدن کے طالب علموں کے لئے باعثِ کشش اور جاذبِ توجہ ہیں۔

تاریخِ اسلام کی ابتدا پیغمبر اسلام کی سیرۃ یا بالفاظِ دیگر آپ کے اُن احکام وافعال سے ہوتی ہے جو اس تحریک کو منظم کرنے، چلانے، اور کامیاب بنانے میں اختیار کیئے گئے تھے، اس اعتبار سے، اسلامی تاریخ کا یہ ابتدائی حصّہ حد درجہ اہم ہے، اور تاریخ کے ہر طالبِ علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اصلِ تحریک کو سمجھنے کے لئے اس حصے کا بغور مطالعہ کرے، کیونکہ بلا اِس کے اسلام کی اصل روح سمجھنا دشوار ہے۔

مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ اُنھوں نے اپنے عظیم پیغمبر کی تعلیمات اور حالاتِ زندگی کے جزئیات کو محفوظ کرنے کے لئے جو جدوجہد کی، اور جو جو طریقے اختیار کیئے، خود ان کی نظیر تاریخِ عالم میں ڈھونڈھے نہ ملے گی، یہ دعویٰ بڑی حد تک بجا معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس سلسلے میں مسلمانوں نے جس بے اندازہ محنت، احتیاط اور تلاش وتنقید کا ثبوت دیا ہے، وہ واقعی قابلِ داد ہے، اور اگرچہ آج تاریخی روایات کو جمع کرنے اور اُن پر جرح وتنقید کے کچھ اور اصول بھی رائج ہو چکے ہیں لیکن یہ پُرانے اصول اور طریقے ہنوز اپنی جگہ ہیں اور ان کی حمایت میں بھی بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔

تاریخی نقطۂ نظر سے پیغمبرِ اسلام کی سرگزشت کو تین بڑے حصوں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے، یعنی:

(۱) عہدِ ماقبلِ نبوّت (۲) مکّی عہد (۳) مدنی عہد

عمومی تاریخ میں یہ آخری حصہ خاص اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ اسی نقطہ سے آنحضرتؐ کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے، اور اِسی مقام سے اسلامی تحریک جو اِس وقت تک خاموش اور "پُرامن" تھی شمشیر بکف ہو کر عملی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔

تاریخِ اسلام کے طالبِ علموں کے لئے آنحضرت کی سیاسی زندگی کا مطالعہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا آپ کی "نظریاتی" تعلیم کا، کیونکہ یہ آپ کی عظیم انقلابی تحریک کا عملی پہلو ہے، اور اس سے ہمیں وہ تمام درجہ بدرجہ

تنظیمی اور سیاسی ترقیاں نظر آسکتی ہیں جن کی بدولت اسلام، مذہب کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ معاشرہ اور مضبوط سیاسی طاقت میں نمایاں ہوتا چلا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی ایک فرد میں نظریات پیش کرنے کی صلاحیت کے ساتھ ساتھ انصرامی قابلیت اور پھر رہنمائی کا جوہر، کارخانۂ قدرت میں سب سے زیادہ نادر الوقوع عجوبہ ہے[1]۔

اس نظر سے دیکھئے تو کسی بھی مصلح، رہنما، ہادی، قائد یا فاتح میں بیک وقت اتنے اوصاف نظر نہیں آتے جتنے تنہا رسولِ عربی کی ذات میں قدرت نے ودیعت کئے تھے جس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ اس عظیم شخصیت نے اگر ایک طرف بالکل نئے قسم کے دینی، معاشی، سیاسی اور اخلاقی نظریات و تصورات پیش کر کے دنیا سے منوالئے تو دوسری طرف دس سال کی قلیل مدت میں ایک ایسی عظیم اور رسائل بہ عروج ریاست اور ترقی پذیر سلطنت کی خود اپنے ہاتھوں سے تشکیل و تاسیس بھی کی جس نے اگلے آٹھ دس سال کے اندر ہی براعظم ایشیا، افریقہ اور یورپ کی دو مضبوط ترین شہنشاہیتوں کو نیست کر ڈالا[2]۔

---

[1] MY STRUGGLE. XI

[2] ڈاکٹر منگانا جیسے مخالف کا خیال ہے:-

"IN ANY CASE, WHATEVER VIEW WE MAY TAKE OF THE CLAOMS OF MOHAMMAD NO ONE CAN DENY THAT HE WAS A GREAT MAN."

"A MAN WHO PUT AN END IN LESS THAN 10 YEARS TO TWO FORMIDABLE KINGDOMS THE KINGDOM OF THE OLD ACHIMENIDES REPRESENTED BY THE CLASSIC SASSANIDES AND THAT OF ROMAN CAESARS OF EASTERN COUNTRIES BY MEANS OF SOME CAMEL DRIVERS OF ARABIA, MUST BE AT ANY RATE TAKEN INTO CONSIDERATION. A CONTROLLER OF CONSOIENCE AND SOUL TO SO MANY MILLIONS AND IN THE PLAIN LIGHT OF CIVILIZATION, IS INDEED GREATER THAN ALEXANDER AND BOUNAPARTE KNOWN ONLY TODAY IN HISTORICAL BOOKS." A. MINGANA LEAVES P XXIV.

یہ سلطنت صحرائے عرب سے اُٹھی ہوئی عارضی آندھی نہ تھی جو فوراً اُتر جاتی بلکہ ایک مضبوط اور مستحکم نظام تھا جس نے تھوڑے ہی عرصے میں وادیٔ سندھ سے لے کر بحرِ ارل (ARAL) تک اور ارل سے لے کر اٹلانٹک (ATLANTIC) تک ایک ہی پرچم کو سربلند کر دیا، جو بڑی مدت تک اسی شان و شکوہ سے لہراتا رہا، اور آج بھی جبکہ ڈیڑھ ہزار سال گزر چکے ہیں، دنیا کے ایک بڑے حصے پر سایہ فگن ہے۔

اس عظیم سلطنت کی ابتدا ان چھوٹی چھوٹی مہموں، اور معرکہ آرائیوں سے ہوئی تھی جن کو سیرت کی اصطلاح میں "غزوات و سرایا" کہا جاتا تھا، اور جو اس اعتبار سے نہایت ہی اہم ہیں کہ اسلام کی تابناک تاریخِ سیاست کا پہلا باب انہیں سے شروع ہوتا ہے۔

سیرۃ کی کتابوں میں ان غزوات و سرایا کے جو دلچسپ حالات ملتے ہیں وہ اتنی تفصیل کے ساتھ ہیں کہ ان کو پڑھنے کے بعد کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ آنکھوں دیکھا حال نہیں، مثلاً ہر غزوے یا سریے کی اصل وجہ، مقامِ جنگ، اُس کا مدینے یا کسی اور مشہور مقام سے فاصلہ مع سمت، امیر جیش یا علمبردار کا نام، پرچم کا رنگ، مسلم فوج کا شعار، شرکاء کی پوری تعداد، مع اسماء مشاہیر، بایں صراحت کہ مثلاً ان میں کتنے اوسی تھے کتنے خزرجی، پھر ان سب کے حلفاء اور دوستوں کی نام بنام نشان دہی، موافق اور مخالف سواروں کی طاقت، گھوڑوں کے نام، نیز یہ کہ کون شخص کس کے ہاتھ سے قتل یا مجروح ہوا؟ اور کس آلے سے؟ پھر وہ تمام خاص خاص گفتگوئیں جو آپس میں یا فریقین کے درمیان ہوئیں، مخالفوں کی جنگی طاقت، اسیرانِ جنگ کے نام، غنائم کی تفصیل، حتیٰ کہ معرکہ کا مہینہ، تاریخ، اور دن تک متعین کیا گیا ہے، اور کسی وجہ سے تاریخ و یوم کی کوئی صراحت نہ مل سکی تو مہینہ ضرور نظر آئے گا۔

ظاہر ہے کہ یہ جملہ تفصیلات اُس وقت تک بیان نہیں کی جا سکتیں، جب تک ان کو فوراً ہی قلم بند کر لیا جائے بالخصوص تاریخ اور دن کا صحیح تعین بلا لکھے ممکن نہیں، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر واقعی یہ روایات درست ہیں اور ان تفصیلات کی حیثیت افسانوی نہیں تو اُن کے "رُواۃ" کے سامنے براہِ راست کچھ ایسی دستاویزیں تھیں جس کا تعلق عہدِ رسالت، بلکہ عہدِ غزوات سے تھا؛

یہی وہ نقطہ ہے، جہاں سے ہمیں روایاتِ سیرۃ پر تنقید کا حق پہنچتا ہے، اور اصولی طور پر ہماری

نظریں کتبِ سیرۃ کے ابتدائی ماخذوں کی طرف اُٹھتی ہیں، کیوں کہ تاریخ صرف مستند ماخذوں کے بیان کردہ واقعات کا نام ہے؛

اس سلسلے میں عمومی تصور یہ ہے کہ یہ جملہ روایتیں، دوسری اور تیسری صدی ہجری سے پہلے ضبطِ تحریر میں نہیں آسکی تھیں[1] چنانچہ اکثر علماء تاریخ کا خیال ہے کہ ابن اسحٰق (المتوفی ۱۵۰ھ) اسلام کے پہلے مؤرخ ہیں[2] جنھوں نے پیغمبر اسلام کی سیرت کو سب سے پہلے لکھا، اور ان منتشر زبانی روایات کو یکجا کیا جو ان کے زمانے میں متداول تھیں، گویا اسلام کی یہ ابتدائی تاریخ عباسیوں کے عہد میں پہلی بار لکھی گئی جبکہ ظہور اسلام کو تقریبًا سوا سو ڈیڑھ سو سال بیت چکے تھے۔

ظاہر ہے کہ اگر یہ خیال صحیح ہے تو اسلامی تاریخ کا یہ ابتدائی حصہ محض چند شکوک اور مشتبہ روایات کا مجموعہ رہ جاتا ہے، جس کی نہ کوئی دستاویزی حیثیت باقی رہتی ہے، نہ تاریخی افادیت، یہ بات قطعًا خارج از قیاس ہے کہ چار پانچ پشتیں گذر جانے کے بعد بھی واقعاتی تفصیلات جوں کی توں اپنے اصلی رنگ میں باقی رہیں، یا یہ کہ ان کا بڑا حصہ ضائع نہ ہو جائے جس کے خلّے کو پُر کرنے کے لئے ان میں رائج الوقت روایات، عقائد، اور تصورات شامل نہ ہو جائیں۔

اس کے مقابلے میں جب ہم ان روایات کی ساخت، ہیئت اور دوسری تفصیلات پر غور کرتے ہیں تو ان میں قدیم سادگی کی پوری جھلک پائی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ واقعاتی تسلسل تک نظر نہیں آتا، جگہ جگہ روایتیں تشنہ رہ جاتی ہیں، درمیان سے ٹوٹ جاتی ہیں اور کسی جوڑنے والے کا پتہ نہیں چلتا، عباسی عہد کے عقائد اور مزعومات اتنی کم روایتوں میں محسوس ہوتے ہیں، جن سے یہ اندازہ ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ روایاتِ سیرۃ کا بڑا حصہ اس دَور سے پہلے ضبطِ تحریر میں آچکا تھا؛

اس صورت میں اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ روایتیں، ابتدائی مدوّنینِ سیرۃ کو بعض قدیم تر ماخذوں سے مکتوبی صورت میں پہنچی تھیں، جن کا تعلق عہدِ رسالت یا عہدِ صحابہ سے تھا[3]، تو اس خیال کی تائید

---

[1] سرسید، خطبات/۳۱۵ [2] A HISTORY OF HISTORICAL WRITINGS VOL: I P 335

[3] اس بحث کیلئے دیکھئے میرا مقالہ "تدوینِ سیرۃ پر ایک نظر" جو عنقریب کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔

میں بہت سی تاریخی شہادتیں اور قیاسات پیش کئے جا سکتے ہیں، بلکہ مثبت دلائل کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ عہدِ رسالت کے یہ ریکارڈ عبداللہ بن عباس - آبان بن عثمان، عروہ بن زبیر وغیرہ قرنِ اول کے مصنفین کو پہنچنا یقینی تھے، مگر مشکل یہ ہے کہ روایاتِ سیرت کا ایک قابلِ لحاظ حصہ پھر بھی سائنٹفک تنقید کا متحمل نہیں ہوتا، اور نتیجے میں تمام روایتوں کو مشکوک بنا دیتا ہے، خاص طور پر توقیتی حصہ (CHRONOLOGICAL) جس پر نہ صرف واقعاتی ترتیب کا مدار ہے بلکہ رُواۃ اور مُدوّنینِ سیرت کے ذہنی رجحانات، مثلاً صداقت، یا وضّاعی، جانچنے کے لئے سب سے اہم کلید کا کام دے سکتا ہے۔ کیونکہ صرف اسی حصے کی جانچ علومِ ریاضیہ کی مدد سے بآسانی ممکن ہے، جس کے جوابات کبھی غیر یقینی نہیں ہوتے۔

سیرت کی کتابوں کو دیکھئے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دُنیا کی قدیم تاریخ میں مورخین اسلام کا یہ ایک بے مثال کارنامہ تھا، کیونکہ جس عہد میں اصولاً یہ توقیتی صراحتیں ریکارڈ ہو جانا چاہئیں، اس میں دنیا کا بڑا حصہ اس درجہ تاریخی شعور سے خالی نظر آتا ہے کہ ہر اہم واقعے کو مُوقّت بتاریخ و یوم اور ہر چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کا ٹھیک ٹھیک زمانہ متعین کیا جائے، جیسا کہ کتبِ سیرت کا عام دستور ہے۔ سیرۃ کی کتابوں میں یوں تو سیکڑوں واقعات کو موقت کیا گیا ہے، اور یہ تاریخیں، اگرچہ بلا کسی ادنیٰ شبہ کے اس طرح بیان کی گئی ہیں، کہ گویا سب کی سب دستاویزی تھیں، مگر جب ان کی جانچ ریاضی کے اصولوں پر کی جاتی ہے تو حیرتناک نتائج نکلتے ہیں، اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ اسلام کی اس ابتدائی تاریخ میں سچائی کے عناصر کم، اور تبلیغی تصور زیادہ ہے، کیونکہ تقریباً تمام اہم واقعات کی توقیتی صراحتوں میں بظاہر اس درجہ تضاد اور تناقص نظر آتے ہیں کہ ان روایات کو تاریخ کا مرتبہ دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ نہ دن تاریخوں سے مطابقت کرتے ہیں نہ مہینے موسموں سے، اور یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ یہ جملہ صراحتیں محض جعلی اور قدیم واعظینِ اسلام کی محض وقتی ذہانت کی پیداوار تھیں، جن کے وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ ان کی جانچ کسی طرح ممکن ہے۔

یہ تاریخی تضادات اتنے گوناگوں ہیں (کہ کتابتی سہو اور تصحیفی غلطیوں کو چھوڑ کر) مندرجہ ذیل پانچ

قسموں پر تقسیم کیئے جاسکتے ہیں۔

اولاً:۔ ایسی تاریخیں ملتی ہیں، جو روایتی ایام سے مطابقت نہیں کرتیں۔

ثانیاً:۔ ایسی تاریخیں موجود ہیں جو روایتی موسموں کا ساتھ نہیں دیتیں۔

ثالثاً:۔ ایسی تاریخیں نظر آتی ہیں جن کی تکذیب دوسرے علمی ذرائع سے ہو جاتی ہے۔

رابعاً:۔ ایک ہی واقعہ کے متعلق دو مختلف اور متضاد تاریخیں نظر آتی ہیں، جن میں وجہ ترجیح مشکل ہے۔

خامساً:۔ واقعات کی ترتیب زمانی میں مؤرخوں کے اختلاف موجود ہیں۔

مگر اس کے ساتھ ہی یہ عجیب بات ہے کہ بہت سی تاریخیں ہر اعتبار سے صحیح اور قابلِ اعتماد بھی نظر آتی ہیں اور اگرچہ ان کی تعداد اور تناسب کم ہے، تاہم یہ یقین دہانی کے لئے کافی ہیں کہ واقعاتِ سیرت کے جمع کرنے میں ابتدائی مدوّنین کے سامنے کوئی بنیادی مواد ضرور موجود تھا ورنہ اصولاً یہ بھی غلط ثابت ہوتیں۔

جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے سیرت کے ابتدائی مصنفین یا وقائع نگاروں کا سلسلہ اگرچہ عہدِ صحابہ بلکہ ایک طرح خود عہدِ رسالت سے جاملتا ہے، لیکن اس عہد کی کتابیں چونکہ آج موجود نہیں اسی لئے قدیم مدوّنینِ سیرت میں صرف دوسری اور تیسری صدی کے مصنفین رہ جاتے ہیں، جن کی تصنیفات پر اگر امتحانی نظر ڈالی جائے تو تقریباً دو تہائی واقعات مشتبہ ہو جاتے ہیں، ایک تہائی تاریخیں جو صحیح ثابت ہوتی ہیں۔ وہ نسبتاً کم اہمیت رکھنے والے واقعات سے تعلق ظاہر کر کے اِس معمّہ کو اور پیچیدہ کر دیتی ہیں کہ اہم واقعات کے ریکارڈ کہاں گئے؟ اور موجودہ ریکارڈ کہاں سے آئے؟

واقعہ کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کسی قدر تفصیل کے ساتھ تمام اصناف کے توفیقی تضادات کا قسم وار جائزہ لیا جائے، اور یہ دیکھا جائے کہ صحیح اور غلط توفیقی صراحتوں کا تناسب کیا ہے؟

ذیل میں قسم اول یعنی تاریخ و ایام کی عدم مطابقتیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) ابن اسحٰق نے ہجرت کے ذیل میں ایک طویل اور دلچسپ قصہ سنانے کے بعد آنحضرتؐ کی "قبا" میں آمد کی تاریخ دو شنبہ ۱۲ ربیع الاوّل ۱ھ بیان کی ہے۔[۱] یہ تاریخ مجمع علیہ ہے اور صدر اوّل

[۱] ابن ہشام ۲/۱۳۶-۱۴۰۔ نیز دیکھیئے واقدی/۲، ابن سعد ۲/۲، مسعودی التنبیہ والاشراف/۲۳۳ البدء والتاریخ ۴/۲۷۷

کے تمام مورخوں نے اسی کو اختیار کیا ہے، حتیٰ کہ بہت سے مستشرقین بھی اس سے اختلاف کی جرأت نہ کر سکے[۱]، مگر اس تاریخ کو جب ریاضی کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ سیرت کی کتابوں میں اتنے اہم واقعے کی تاریخ بھی صحیح محفوظ نہیں، چنانچہ تقویمی حساب سے ۱۲ ربیع الاول ۱ھ کو بجائے دوشنبہ کے جمعہ کا دن پڑتا ہے۔

اس غلطی کو سب سے پہلے شاید البیرونی نے پکڑا، اور حسابی قاعدوں سے ثابت کر دیا کہ یہ روایت غلط ہے اور تاریخ ہجرت، حقیقتاً ۱۲ ربیع الاول نہیں، بلکہ ۸ ربیع الاول تھی[۲]، کیوں کہ دوشنبہ آٹھ ۸ ربیع الاول کو پڑتا ہے، چوں کہ یہ مسئلہ خالص حسابی تھا، اس لئے عہدِ حاضرہ کے کئی بڑے بڑے مصنفین[۳] حتیٰ کہ بعض علمائے اسلام نے بھی ہتھیار ڈال دیئے[۴] اور معناً روایت کی تغلیط کر دی، مگر شاید یہ نہ سوچا کہ

"تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم"

چنانچہ دوسری مثالیں ملاحظہ فرمایئے،

(۲) ۲ھ میں پیغمبر اسلام نے قریش کی تجارتی ناکہ بندی کرنا چاہی، تو اس سلسلے میں کئی اقدامات کئے گئے، اور مختلف اوقات میں چھوٹی بڑی مہمیں روانہ ہوتی رہیں، "غزوۂ ینبع" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی، بیان کیا جاتا ہے، کہ یہ مہم ۲ شعبان ۲ھ کو پنجشنبہ کے دن روانہ ہوئی تھی،[۵] حساب کے بموجب ۲ شعبان کو پنجشنبہ ممکن نہیں بلکہ یکشنبہ تھا۔

(۳) اسی سنہ میں آنحضرتؐ نے حجاز کے ساحلی علاقے کے متعدد قبائل سے سیاسی اور تجارتی اغراض کے تحت کئی معاہدے کئے تھے، بنو اسلم اور غفار سے جو معاہدے ہوئے تھے، ان کے لئے ایک روایت کے بموجب شنبہ ۱۴ شعبان ۲ھ کو پیغمبر اسلام تشریف لے گئے تھے[٦]، اصولِ تقویم کے حساب سے یہ تاریخ بھی صحیح نہیں اور ۱۴ شعبان ۲ھ کو جمعہ پڑتا ہے۔

(۴) یہ واقعات اگرچہ کم مشہور، اور چھوٹے چھوٹے ہیں، نیز یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ابن حبیب سیرت

---

۱ MUIR - LIFE ۔ MENTOGOMY P. ۲ آثار الباقیہ (سخاؤ) ۳۲۷
۳ MARGOBOUTHRISE PXX 212 ۴ مولانا شبلی سیرۃ ۱/۲۷۷ ۵ ابن حبیب ۱۱۱ ٦ ایضاً۔

کے معاملے میں کوئی سند نہیں، مگر بدر کی عظمت سے کسے انکار ہوگا؟ اسلام کی پوری تاریخِ محاربات میں اس سے اہم واقعہ شاید کوئی دوسرا نہیں، علمائے سیرت نے بھی اس کی تفصیلات محفوظ رکھنے کی جس درجہ کوششیں کی ہیں، وہ کسی دوسرے واقعہ کو نصیب نہ ہو سکیں، اس لئے یہ امید بالکل بجا تھی کہ کتبِ سیرۃ میں کم سے کم اس واقعہ کی صحیح تاریخ ضرور محفوظ ملے گی، چنانچہ نہ صرف ابن اسحٰق اور واقدی بلکہ دوسرے علمائے سیر بھی متفق ہیں کہ یہ معرکہ ۱۷ر رمضان ۲ھ کو جمعہ کے دن پیش آیا تھا۔[1]

مستدرک حاکم میں عامر بن ربیعہ بدری سے جو روایت منقول ہے، اس سے اگرچہ ایک ہلکے سے اختلاف کا پتہ چلتا ہے، جو قمری مہینوں میں نیا نہیں، یعنی یہ کہ معرکۂ بدر بجائے ۱۷ر کے ۱۶ر رمضان کا واقعہ ہے[2] تاہم جمعہ کے دن، اور ۱۶ر یا ۱۷ر رمضان پر سب کا اتفاق ہے، حتیٰ کہ سب سے قدیم سیرت نگار عروہ بن زبیر نے بھی جمعہ کا دن اور ۱۶ر یا ۱۷ر دو تاریخیں بیان کی ہیں[3] مگر جب اس تاریخ کا مقابلہ تقویمی جدولوں سے کیا جاتا ہے تو از روئے حساب ۱۶ر رمضان ۲ھ کو بجائے جمعے کے دوشنبہ اور ۱۷ر کو سہ شنبہ پڑتا ہے۔

اسی سنہ کے ایک اور بڑے واقعہ کی تاریخ کا امتحان کیجئے۔

(۵) غزوہ بنو قینقاع معرکۂ بدر سے تھوڑے ہی عرصہ بعد کا واقعہ ہے، اور جس طرح معرکۂ بدر مشرکین قریش کے مقابلے میں پہلا کامیاب محاربہ تھا، ٹھیک اسی طرح یہ غزوہ یہودیوں کے خلاف پہلی کامیاب آویزش تھی۔

سیرت نگار پورے وثوق سے اس مہم کی تاریخ شنبہ ۱۵ر شوال بیان کرتے ہیں،[4] مگر اس کے مقابلے میں ہجری تقویم ۱۵ر شوال ۲ھ کو سہ شنبہ بتاتی ہے۔

اسی طرح غزوہ سویق کی تاریخ ملاحظہ ہو۔

(۶) بیان کیا جاتا ہے کہ معرکۂ بدر میں شکست کے بعد قریش کو جو شدید نقصانات پہنچے تھے، ان کا انتقام لینے رئیس مکہ ابو سفیان نے ذوالحجہ ۲ھ میں عین مدینہ پہنچ کر شب خون مارنا چاہا۔

---

[1] ابن سعد ۱۳/۲، واقدی/۳، ابن ہشام ۲۵۶/۱ طبری ۲۸۰/۲ [2] مستدرک ۳۵۸/۳
[3] الدر المنثور ۱۸۸/۳ [4] واقدی/۱۷۷- ابن سعد ۲/ نیز دیکھئے زرقانی ۵۵۰/۱

چنانچہ قریش کا لشکر حوالئ مدینہ میں داخل ہوگیا، اس واقعہ کی تاریخ یکشنبہ ۵ ذوالحجۃ[1] مذکور ہے، مگر تقویمی شہادت یہ ہے کہ ۵ ذوالحجۃ ۲ھ کو بجائے یک شنبہ کے سہ شنبہ تھا۔

تاریخ و ایام کی یہ نامطابقتیں صرف ۱ھ و ۲ھ تک محدود نہیں بلکہ ان کا سلسلہ آخر تک یوں ہی چلا گیا ہے، اور خاص طور پر اہم واقعات کی تاریخیں روایتی ایام سے مطابقت نہیں کرتیں، چنانچہ ۳ھ کا سب سے اہم واقعہ ملاحظہ ہو۔

(۷) معرکۂ اُحد سے زیادہ ناقابلِ فراموش مہم شاید کوئی دوسری نہیں، کیوں کہ اس میں ایک طرف مسلمانوں کا کثیر اتلافِ جان ہوا تھا تو دوسری طرف خود پیغمبرِ اسلامؐ بھی شدید زخمی ہوئے تھے، اس غزوہ کی مستند ترین اور مجتمع علیہ تاریخ ۱۱ شوال ۳ھ بیان کی جاتی ہے، اور ہفتے کے دن پر سب کا اتفاق ہے۔ تقویمی حسابات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ تاریخ بھی غلط ہے اور ۱۱ شوال کو ہفتہ نہیں بلکہ چہارشنبہ تھا[2]۔

(۸) احد کے بعد ۴ھ کا سب سے مشہور واقعہ غزوہ بنو نضیر ہے، جس کی تاریخ سہ شنبہ ۱۲ ربیع الاول ۴ھ متعین ہے[3] مگر تقویمی حسابات سے یہ تاریخ بھی مطابقت نہیں کرتی، کیوں کہ از روئے حساب ۱۲ ربیع الاول ۴ھ کو سہ شنبہ کی جگہ پنجشنبہ آتا ہے،

(۹) اسی ۴ھ کی ایک دوسری مُہم غزوہ بدر موعد کے نام سے مشہور ہے، جس کی تاریخ پنجشنبہ مستہل شعبان بیان کی گئی ہے[4] یہ تاریخ بھی حسابی رُو سے غلط ہے اور مستہل شعبان کو یکشنبہ یا دوشنبہ کا دن آنا چاہیے۔

(۱۰) ۶ھ کا سب سے اہم واقعہ جو اسلامی تاریخ پر حد درجہ مؤثر ہوا، خسرو پرویز (شاہِ ایران) کا قتل ہے، اس کی تاریخ ۱۰ جمادی الاولیٰ ۷ھ بیان کی گئی ہے[5]۔ (اس میں شاید ۷ھ سہو کتابت ہے

[1] واقدی ۳/۱۸۲، ابن سعد ۲/۲۰، مواہب ۱/۱۱۵، عیون الاثر ۳۹۶، دیار بکری ۱/۴۱۰، زرقانی ۱/۵۵۲
[2] البدایہ والنہایہ ۴/۹، مواہب ۱/۱۱۶، عیون الاثر ۲/۱، دیار بکری ۱/۴۱۹ [3] ابن حبیب ۱۱۳ [4] ایضاً
[5] طبری ۳/۹۱، نیز دیکھئے ابن خلدون ۲/۳۸

تاہم یہ تاریخ نہ ۵ھ میں درست بیٹھتی ہے نہ ۶ھ میں، کیونکہ حسابی قاعدہ سے ۱۰ر جمادی الاولیٰ ۶ھ کو سہ شنبہ نہیں پڑتا بلکہ یک شنبہ آتا ہے، اور ۵ھ میں پنجشنبہ۔

سب سے آخر میں مجھے دو واقعات کی تاریخیں اور پیش کرنا ہیں جن کا تعلق ۸ھ سے ہے یعنی فتح مکہ اور غزوۂ حُنین کی، جو اسلامی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

(۱) بیان کیا جاتا ہے کہ فتح مکہ کے سلسلے میں مسلمان فوجیں چہار شنبہ ۱۰ر رمضان ۸ھ کو نکلی تھیں[۱] اور یوم فتح جمعہ ۲۰ر رمضان ۸ھ متعین ہے[۲]، مگر حساب سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ ۱۰ر کو چہار شنبہ ممکن ہے نہ ۲۰ر کو جمعہ، بلکہ ۱۰ر رمضان ۸ھ کو دو شنبہ آتا ہے۔

اسی طرح غزوۂ حنین کی تاریخ بھی تقویمی حسابات پر پوری نہیں اترتی، کیونکہ از روئے روایت ۶ر شوال ۸ھ کو ہفتے کے دن مسلمان فوجیں[۳] مکے سے روانہ ہوئی تھیں، مگر حسابی قاعدے سے ۶ر شوال ۸ھ کو ہفتہ ممکن نہیں بلکہ پنجشنبہ کا دن تھا۔

سطورِ بالا میں جو روایتی تاریخیں پیش کی گئی ہیں، اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یا تو یہ جملہ صراحتیں قطعی جعلی ہیں اور صرف اس لئے وضع کی گئی ہیں کہ ان کے ذریعہ واقعات سیرت کو وزن دار کیا جائے، اور اِن زبانی کہانیوں کو تاریخی مرتبہ دیدیا جائے جو دوسری صدی میں مروج تھیں یا جیسا کہ بعض مستشرقین کا خیال ہے، ہمارے متداولہ حسابات میں کہیں ایسا جھول ہے جو اس وقت ہمارے سامنے نہیں، مگر اس تصور کے امکانات یوں کم ہو جاتے ہیں کہ انھیں حسابات سے بعض تاریخیں بالکل صحیح بھی ثابت ہوتی ہیں اور یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ غلطیاں مروجہ حسابی طریقے کا نتیجہ ہیں، کیوں کہ اگر یہ حسابات غلط ہوتے تو مندرجہ ذیل واقعات کی تاریخیں بھی غلط ہو جاتیں، حالانکہ یہ تاریخیں بالکل صحیح ہیں، ملاحظہ ہوں،

درست تاریخیں (۱) ۲ھ کے ابتدائی واقعات میں ایک غزوہ طلب کرز بن جابر فہری کے نام سے مشہور ہے ابن حبیب نے اس کی تاریخ دو شنبہ ۱۲ر جمادی الاُخریٰ بیان کی ہے۔[۴] ہجری تقویم کے بموجب یکم جمادی الاخریٰ،

---

[۱] ابن سعد ۹۷/۲، نیز دیکھئے ابن ہشام ۴۳/۴ طبری ۱۱۴/۳ البدایہ ۲۸۵/۴ [۲] ابن سعد ۹۹/۲، دیار بکری ۸۷/۲ [۳] ابن سعد ۱۰۸/۲ [۴] ابن حبیب / ۱۱۱۔

کو چہار شنبہ تھا، اس اعتبار سے ۱۲ر جمادی الاُخریٰ کو یکشنبہ آتا ہے، مگر جیسا کہ سب جانتے ہیں قمری مہینوں میں اس یک روزہ فرق کی کوئی اہمیت نہیں اور ابن حبیب کی صراحت صحیح معلوم ہوتی ہے۔

(۲) سیرت کی کتابوں میں ایک چھوٹا سا واقعہ سریۂ عبداللہ بن اُنیس کہلاتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرت ؐ نے محرم ۴ھ میں عبداللہ کو بنو ہذیل کے سردار سُفیان بن خالد کو قتل کرنے کے لئے متعین کیا تھا، اس واقعہ کی تاریخ خود عبداللہ بیان کرتے ہیں، کہ "میں مدینے سے دو شنبہ کے دن ۵ر محرم کو نکلا"[۱] حسابی رُو سے یہ تاریخ بالکل صحیح ہے اور ۵ر محرم کو دو شنبہ ہی کا دن پڑتا ہے۔

(۳) ۵ھ کے مشہور غزوۂ خندق کی تاریخی صراحت کا ابتدائی حصہ بھی تقریباً صحیح معلوم ہوتا ہے، ابن حبیب کا بیان ہے کہ پیغمبرِ اسلام ؐ اس غزوہ کے لئے پنجشنبہ ۱۰ر شوال کو نکلے تھے[۲] ہجری تقویم کے بموجب یکم شوال ۵ھ کو دو شنبہ تھا، اس حساب سے پنجشنبہ کی ۱۰ر کے بجائے ۱۱ر شوال ہوتی ہے، گویا صرف ایک دن کا فرق پڑتا ہے، جو قابلِ التفات نہیں۔

(۴) اسی طرح عمرۂ حدیبیہ کی تاریخ بھی صحیح معلوم ہوتی ہے۔ ابن سعد نے صراحت کی ہے، کہ آنحضرت ؐ حُدیبیہ کے لئے دو شنبہ کے دن یکم ذیقعدہ کو عازمِ مکّہ ہوئے تھے[۳] ہجری تقویم کے مطابق یکم ذی قعدہ ۶ھ کو (۲۹ر کا چاند مان کر) اگرچہ یکشنبہ پڑتا ہے، لیکن ایک دن کا یہ فرق ایسا نہیں کہ تاریخ کو غلط قرار دیا جا سکے اور اگر ۳۰ کا چاند مان لیا جائے تو پھر دو شنبہ ہی کی پہلی ہوگی۔

(۵) ۷ھ کا سب سے مشہور واقعہ عمرۃ القضا ہے، ابن حبیب نے اس کی تاریخ بھی دو شنبہ ۶ر ذیقعدہ بیان کی ہے[۴]، حسابی رُو سے ذیقعدہ ۷ھ کی پہلی تاریخ کو (۲۹ر کا چاند مان کر) پنجشنبہ تھا، اس لئے دو شنبہ کا دن بجائے ۶ر کے ۵ر کو پڑتا ہے، لیکن "۳۰ر" کا چاند مان لیا جائے تو یہ تفاوت بھی نہیں رہتا۔

(۶) سب سے آخر میں پیغمبرِ اسلام ؐ کی رحلت کا ریکارڈ بھی بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے، ابنِ سعد نے

---

[۱] واقدی/ ۳۳۱ - نیز دیکھئے ابن سعد ۲/ ۳۱، دیار بکری ۱/ ۴۵۰ [۲] ابن حبیب/ ۱۱۳

[۳] ابن سعد ۲/ ۶۹، قسطلانی ۱/ ۱۶۳ [۴] ابن حبیب/ ۱۱۵

اس کی تاریخ دوشنبہ ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ بیان کی ہے[۱] یہ تاریخ اس اعتبار سے متفق علیہ ہے کہ کلینی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے[۲] تقویمی قاعدے سے (۲۹، کا چاند مان کر) یکم ربیع الاول چہارشنبہ کو تھی، لیکن اگر ۳۰ کا چاند مان لیا جائے تو ۱۲ ربیع الاول کو ٹھیک دوشنبہ پڑتا ہے۔

متذکرہ بالا سرسری تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ منجملہ (۱۸) توقیتی صراحتوں کے کم از کم چھ صحیح اور بارہ غلط ہیں، گویا ⅓ حصہ صحیح اور ⅔ غلط، پھر جو صحیح بھی ہیں، اُن میں سوائے پیغمبرِ اسلام کی رحلت اور غزوۂ خندق کے اور کوئی واقعہ ایسا اہم نہیں، جو بدر و اُحد یا فتح مکہ اور حُنین کا مقابلہ کرسکے، غالباً یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے کے مصنفین اس قسم کی توقیتی صراحتوں کے شجرِ ممنوعہ تک جاتے ہوئے ڈرتے ہیں، اور ان کی کتابوں میں دو ایک واقعات کی تاریخیں بھی نہیں ملتیں، تاہم حیرت ہے کہ مہینوں اور سالوں کو ابھی تک ترک نہیں کیا گیا حالانکہ موسمی شہادتیں ان کے خلاف بھی صف آرا ہیں۔ میں یہاں ان کے کچھ نمونے اور مثالیں پیش کرتا ہوں۔

مہینوں اور موسموں میں اختلاف (۱) سب سے پہلے غزوۂ بدر کو لیجئے مختلف تاریخی قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کا تعلق خاص موسمِ گرما سے تھا۔ جبکہ موسم پورے شباب پر آچکا تھا۔

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بدر کے دن شدید گرمی تھی، اور تمازتِ آفتاب کا یہ عالم تھا کہ مقتولینِ بدر کی لاشیں اسی روز (شام سے پہلے) سڑ گئی تھیں[۳] خود قرآن سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ موسم کافی سخت تھا، اور مسلمان بارش کی دعائیں مانگنے پر مجبور تھے (اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ)[۴] جن کو شرفِ قبولیت بخشا گیا، قرآن میں اس غیر متوقع بارش کا ذکر اس تفصیل اور انداز سے کیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سرمائی بارش نہ تھی، بلکہ موسمِ گرما کی شدت دور کرنے کے لئے ایک کرشمۂ قدرت تھا مگر حسابی قاعدے سے رمضان ۲ھ فروری اور مارچ ۶۲۳ء سے مطابق ہوتا ہے، جبکہ حجاز میں گرمی نہیں ہوتی،

(۲) ایک اور واقعہ ملاحظہ فرمایئے جو عین بدر کے بعد کا ہے، اور جس سے خود غزوۂ بدر کے

---

[۱] ابن سعد ۱/۳۷ [۲] کلینی ابواب التاریخ [۳] مسلم ۲/۹۲ مصر ابن سعد ۲/۱۵ [۴] قرآن ۸: ۱۱

صحیح موسم کا نقشہ سامنے آجاتا ہے، اہلِ سِیر کہتے ہیں کہ شوال ۲ھ میں (بدر سے واپسی کے بعد) ایک شاتمِ رسول یہودی کو جس کا نام ابوعفک تھا کسی مسلمان نے قتل کر دیا، روایت میں صراحت ہے، کہ یہ زمانہ موسمِ گرما کا تھا اور یہودی گرمی کی شدت کی وجہ سے کھلے آسمان کے نیچے صحن میں سو رہا تھا[1]۔ یہ واقعہ خاص مدینے کا ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ صرف اس واقعہ کا بلکہ معرکۂ بدر کا تعلق بھی موسمِ گرما سے تھا، کیونکہ ایک وسطِ رمضان کا واقعہ ہے تو دوسرا اوائلِ شوال کا، تاہم ان دونوں واقعات کی توقیت بظاہر غلط معلوم ہوتی ہے، کیونکہ جس طرح حجاز میں فروری اور مارچ کے مہینے موسمِ گرما میں شامل نہیں، اسی طرح مدینہ میں اپریل کا موسم اتنا گرم نہیں ہوتا کہ لوگ کھلے آسمان کے نیچے سو سکیں، حسابی رُو سے شوال ۲ھ مارچ اپریل ۶۲۳ء سے مطابق ہوتا ہے۔

(۳) اسی طرح غزوۂ اُحد کا مہینہ شوال ۳ھ بیان کیا جاتا ہے، تاریخ میں صراحت موجود ہے اس لڑائی کے دنوں میں تازہ اور نو رس کھجوریں (رطب) بہ افراط موجود تھیں[2]۔ مدینہ میں تازہ کھجوروں کا موسم ویسے تو وسطِ جولائی سے پہلے شروع نہیں ہوتا، لیکن بعض قسمیں مثلاً حلیہ وغیرہ جلد آجاتی ہیں، اور آخر جون میں ملنا شروع ہو جاتی ہیں، اس اعتبار سے اس غزوہ کا موسم کم سے کم آخر جون ہونا چاہئے۔ مگر ہجری تقویم کے بموجب شوال ۳ھ، مارچ اپریل ۶۲۴ء سے مطابق ہوتا ہے جبکہ مدینے میں کھجوروں کا نام و نشان بھی نہیں ہوتا، اس سے بظاہر یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ یا تو اس لڑائی کا صحیح مہینہ رواۃ کے ذہن سے اُتر گیا، یا پھر متذکرہ بالا تفصیلات صحیح نہیں،

یہاں یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے، کہ اُحد کی ان تفصیلات سے بدر کے موسم کی مزید تصدیق ہو جاتی ہے، کیوں کہ غزوۂ اُحد بدر سے ٹھیک ایک سال بعد کا واقعہ ہے، اور یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر معرکۂ اُحد کے زمانے میں تازہ کھجوریں موجود تھیں، تو بدر کا موسم بھی اسی کے لگ بھگ ہوگا۔

اس قسم کی توقیتی نامطابقتیں ایک دو واقعات تک محدود نہیں بلکہ ان کا سلسلہ کافی طویل ہے

---

[1] واقدی/۱۷۵، ابن سعد ۲/۱۹ [2] MUIR - Life 267 واقدی/۳۲۱

ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔

(۴) مؤرخین کہتے ہیں کہ غزوہ موتہ کے بعد جمادی الاخریٰ ۸ھ میں پیغمبرِ اسلامؐ نے شامی سرحد کے عرب قبائل کو ہموار کرنے کے لیئے عمرو بن عاص کو روانہ کیا تھا۔[۱] سیرت نگاروں کی اصطلاح میں اس مہم کو "سریۂ ذاتِ سلاسل" کہتے ہیں، روایتی صراحتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سریہ موسمِ سرما میں روانہ ہوا تھا، مستدرک حاکم میں ایک روایت خود عمرو بن عاص سے مروی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سفر میں اس بلا کی سردی تھی کہ وہ ایک بار صبح کو غسل تک نہ کرسکے، اور نماز تیمم سے پڑھانا پڑی تھی،[۲]

مگر ہجری تقویم کے مطابق یہ جمادی الاخریٰ ستمبر، اکتوبر ۶۲۹ء کا متوازی مہینہ ثابت ہوتا ہے۔ جو عرب میں عین بہار کا زمانہ ہے، یاد رہے کہ مؤرخین کے قول کے بموجب اس واقعہ سے صرف ایک ماہ پہلے غزوۂ موتہ (جمادی الاولیٰ ۸ھ) کا موسم کافی گرم تھا، (وَذٰلِکَ فِی حَرٍّ شَدِیدٍ[۳]) جس سے بظاہر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یا تو متذکرہ بالا موسمی تصریحات غلط ہیں یا پھر اس سریہ کا صحیح مہینہ محفوظ نہیں رہا۔

(۵) اس سلسلے میں مجھے چند مثالیں اور پیش کرنا ہیں، جن میں پہلے فتح مکہ کی مثال پر غور فرمایئے۔ اس غزوہ کے متعلق مؤرخینِ اسلام کا عام بیان یہ ہے کہ "یہ رمضان ۸ھ کا واقعہ ہے" نیز یہ کہ مسلمان فوجیں جب مدینہ سے نکلی تھیں تو صائم تھیں، خود پیغمبرِ اسلامؐ کا بھی روزہ تھا، اور سب مسلمان بھی روزہ دار تھے، گرمی کا یہ عالم تھا کہ حضرت ابوہریرہؓ جو اس غزوہ میں آنحضرتؐ کے ہمرکاب تھے، کہتے ہیں "میں نے رسول اللہؐ کو عرج میں دیکھا کہ آپؐ گرمی کی وجہ سے سر پر پانی بہا رہے تھے، کیوں کہ آپ روزہ دار تھے"[۴] مگر اس کو کیا کہیئے کہ حسابی رُو سے رمضان ۸ھ کا متبادل مہینہ دسمبر اور جنوری ثابت ہوتا ہے، اور ہم انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں کہ خاص موسمِ سرما میں آنحضرتؐ کو سر پر پانی بہانے کی نوبت کس طرح آئی؟

(۶) اس بات کا اندازہ کہ فتح مکہ کے زمانے میں موسمِ گرما پورے شباب پر تھا، غزوۂ حنین کی تفصیلات سے بھی ہوتا ہے، کیونکہ یہ دونوں غزوے تقریباً ایک ہی پندرہ واڑے کے ہیں۔

---

[۱] طبری ۳/۱۰۴، ابن ہشام ۴/۲۷۲ [۲] مستدرک ۱/۱۷۷ نیز دیکھئے البدایہ والنہایہ ۴/۲۷۴
[۳] طبری ۳/۱۱۰۔
[۴] مستدرک ۱/۴۳۲ نیز دیکھئے موطا: ماجاء فی الصیام فی السفر۔

ایک مجاہد کا بیان ہے کہ "ہم رسول اللہؐ کے ہمراہ غزوہ حُنین میں شریک تھے، تو ایک سخت اور شدید گرم دن میں (فی یوم قائظ شدید الحر) روانہ ہوئے اور ایک درخت کے سایہ میں قیام کیا، جب سورج ڈھل گیا تو میں نے اپنی زرہ پہنی اور گھوڑے پر سوار ہوا"[۱]

یہ واقعہ ۶ر شوال ۸ھ کا ہے جو از روئے حساب ۲۷ر جنوری ۶۳۰ء کو پیش آنا چاہیے اسلئے ظاہر ہے کہ یا تو یہ موسمی تفصیلات غلط ہیں یا ان دونوں غزدوں کی مبتینہ تاریخوں کو غلط قرار دینا پڑیگا۔

اب میں صرف دو مثالیں اور پیش کر کے قارئین سے التجا کروں گا کہ وہ اِن متضاد روایات کی روشنی میں واقعاتِ سیرت کی توقیتی اُلجھنیں ملاحظہ کریں، ان میں سے پہلی مثال سریۂ علقمہ بن مُجزز کی ہے، اور دوسری غزوہ تبُوک کی جو پیغمبرِ اسلامؐ کا آخری غزوہ ہے۔

(۷) کہتے ہیں کہ فتح مکّہ سے تقریباً چھ ماہ بعد ربیع الآخر ۹ھ میں آنحضرتؐ نے ایک فوجی دستہ علقمہ بن مُجزز کی سرکردگی میں جدّہ روانہ کیا تھا، اِس دستے کی واپسی کے متعلق یہ تفصیل ملتی ہے کہ سپاہی الاؤ لگا لیتے، جن پر کھانا بھی پکتا اور وہ تاپتے بھی (یصطلون علیھا و یصطلعون)[۲] اس صراحت سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ اس سریہ کا موسم فی الجملہ سرد تھا اور سپاہی آگ تاپنے پر مجبور تھے، بیان کیا جا چکا ہے کہ از روئے روایات، فتح مکّہ اور غزوہ حُنین کا موسم انتہائی گرم تھا، اس لئے ربیع الآخر ۹ھ میں (ان واقعات سے چھ مہینے بعد) قدرتی طور پر سردی کا زمانہ ہونا چاہیے۔ جس سے یہ الاؤ لگانے کا قصہ صحیح معلوم ہوتا ہے، مگر ہجری حساب سے، ربیع الآخر ۹ھ، ۱۸ر جولائی ۶۳۰ء سے مطابق ہوتا ہے یعنی شدید موسمِ گرما سے، اس لئے یا تو ربیع الآخر کی صراحت غلط قرار دینا پڑے گی یا الاؤ پر تاپنے کی کہانی؟

(۸) اسی طرح غزوہ تبوک کا موسم بھی روایتی مہینے سے مطابقت نہیں کرتا جو رجب ۹ھ کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے، قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ جب پیغمبرِ اسلامؐ نے مسلمانوں کو اس غزوہ پر چلنے کی ترغیب دی تو منافقین نے بہکانا شروع کیا اور کہا اتنی شدید گرمی میں نہ نکلو (لاتنفروا فی الحر)[۳] اس کا جواب یہ دیا گیا کہ جہنم کی آگ سب سے زیادہ گرم ہے (قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا)[۳] مگر ان موسمی

[۱] ابن سعد ۱۱۲/۲ [۲] ابن سعد ۱۱۸/۲ [۳] ایضاً ۹۔

صراحتوں کا مقابلہ جب ہجری تقویم سے کیجئے تو رجب ۹ھ اکتوبر، نومبر ۶۳۰ء سے مطابق ہوتا ہے۔ اور رمضان شوال کے مہینے جن میں مسلمان فوج تبوک سے واپس آئی تھی۔ دسمبر، جنوری اور فروری سے مطابقت کرتے ہیں،

ان موسمی نامطابقتوں کو دیکھتے ہوئے آپ قیاس کر سکتے ہیں کہ روایات سیرت، اور خاص طور پر ان کی توقیتی صراحتوں کی بظاہر کیا وقعت رہ جاتی ہے ؟ اور ہم کس طرح یقین کر سکتے ہیں کہ یہ روایات ہم تک معتبر ذرائع سے پہنچی ہیں ؟ تاہم بعض خوش عقیدہ مستشرقین کی رائے میں اس قسم کے موسمی تفاوت صرف اس بات کا نتیجہ ہیں، کہ ظہور اسلام کے وقت جو عربی کلینڈر رائج تھا، وہ موجودہ ہجری کلینڈر سے بہت کچھ مختلف تھا، مگر اس خیال کو قبول کرنے میں بھی چند در چند دشواریاں اور رکاوٹیں ہیں، کیوں کہ کتب سیرت میں متعدد واقعات ایسے بھی ملتے ہیں جن کی موسمی تفصیلات موجودہ کلینڈر سے پوری طرح مطابقت کرتی ہیں، اور یہ کسی عنوان نہیں کہا جا سکتا کہ واقعات کی توقیت کے سلسلے میں مروجہ کلینڈر بیکار ہے، یہاں ان کی مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

موسمی مطابقت کی مثالیں

(۱) ۳ھ کا ایک مشہور واقعہ کعب بن اشرف کے قتل کی روداد ہے، کہتے ہیں کہ ربیع الاول کے مہینے کی ۱۴ تاریخ تھی اور چودھویں کا چاند اپنی پوری آب و تاب سے فضا کو منور کئے ہوئے تھا۔ کعب کے قاتل جب اس کے دروازے پر پہنچے تو وہ اندر تھا، ان کی آواز سے باہر نکلا اور گفتگو میں مصروف ہو گیا۔ یہ لوگ کچھ دیر چاندنی میں ٹہلتے رہے، پھر ایک جھرنے (WATER FALL) کے قریب بیٹھ گئے۔[ل] اور شب ماہتاب کی رعنائیوں کا لطف لینے لگے، کعب کا سر معطر تھا، اس کے بالوں کی بھینی بھینی خوشبو نے پوری فضا کو معطر کر دیا تھا، قاتل بار بار اس کے بالوں کی لٹیں سونگھتے اور چھوڑ دیتے، مگر ایک بار انھیں لٹوں کو کسی نے پکڑ کر کھینچ لیا۔ اور سر تن سے جدا کر دیا۔

یہ پوری داستان موسم بہار کی ایک ستھری چاندنی کو یاد دلاتی ہے، اور واقعہ بھی یہی ہے، کیوں کہ ربیع الاول ۳ھ کی ۱۴ تاریخ ۶ ستمبر ۶۲۴ء سے مطابق ہوتی ہے، جو حجاز میں آغاز بہار کا زمانہ ہے۔

MUIR *Life* 247 ل

اس واقعہ کی تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارا موجودہ کلینڈر بیکار نہیں، ایک دوسرا واقعہ اور ملاحظہ ہو جو اسی ۳ھ کا ہے۔

(۲) غزوۂ "بدر" کے بعد جب قریش نے یہ محسوس کرلیا کہ ان کی تجارتِ شام غیر محفوظ ہوگئی۔ اور خطرے سے خالی نہیں، تو انھوں نے عراق سے تجارتی تعلقات قائم کرنا چاہے، تجویز کیا گیا کہ موسم سرما (شتاء) میں ایک قافلہ "عراق" بھیجا جائے، چنانچہ یہ قافلہ روانہ ہوا، مگر مسلمانوں کو اس کی اطلاع ہوگئی، قافلہ جب "قردہ" کے پاس پہنچا، تو زید بن حارثہ نے اس کو جالیا۔ اس سریّہ کی تاریخ جمادی الاخری ۳ھ[1] بیان کی جاتی ہے، اور تمام سیرت نگار اس پر متفق ہیں، کہ یہ واقعہ (شتاء) یعنی موسمِ سرما کا ہے۔

یہ تاریخ بھی بالکل درست معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ از روئے حساب جمادی الاخریٰ ۳ھ نومبر دسمبر ۶۲۴ء سے مطابق ہوتا ہے، اس لئے یہ کہنا ممکن نہیں کہ مروّجہ کلینڈر نا قابلِ اعتبار ہے۔

(۳) اسی طرح غزوۂ خندق کا موسم بھی روایتی تاریخ سے مطابقت کرتا ہے، کتبِ سیر تمام میں یہ صراحت موجود ہے کہ یہ جنگ موسمِ سرما ہی میں ہوئی تھی[2] سردی اور باد و باراں کی یہ کیفیت تھی کہ محاصرین کے خیموں اور راؤٹیوں کی طنابیں اکھڑ اکھڑ جاتی تھیں، کھانا پکانے کے ظروف الٹ پلٹ جاتے، آگ نے جلنے کی قسم کھالی تھی، ان پریشانیوں سے تنگ آکر جب قریش نے محاصرہ اٹھایا تو آنحضرتؐ نے کچھ آدمی مقرر کرنا چاہے کہ وہ دشمن کی فوج کی خبریں پہنچائیں، مگر یہاں بھی خوف، بھوک اور سردی کی شدت کی وجہ سے کوئی کھڑا نہ ہوا[3]۔

اس غزوے کی تاریخ شوال ۵ھ بیان کی جاتی ہے، جو حسابی قاعدے سے فروری، مارچ ۶۲۶ء سے مطابق ہوتی ہے، چونکہ مدینے میں یہ زمانہ سخت سردی کا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ یہ تاریخ بھی موسم سے مطابق ہے۔

(۴) اس سلسلے میں مجھے صرف ایک مثال اور پیش کرنا ہے، جو غزوۂ "موتہ" کی ہے، اس غزوے کا روایتی موسم تاریخ سے مطابقت کرتا ہے۔ کیونکہ "طبری" میں یہ صراحت ہے کہ یہ واقعہ موسمِ گرما کا تھا

---

[1] واقدی/ ۱۹۵، ابن سعد ۲/ ۲۴۔ ابن سید الناس/ ۳۰۵ قسطلانی/ ۱۱۹ دیار بکری ۱/ ۴۱۶۔
[2] ابن ہشام ۳/ ۲۴۲ طبری ۳/ ۵۱ [3] طبری ۳/ ۵۲

(وَذٰلِكَ فِي حَرٍّ شَدِيْدٍ)[1]

مؤرخین اس کی تاریخ جمادی الاولیٰ ۹ھ بیان کرتے ہیں، جو ہجری تقویم کے بموجب اگست دستمبر ۶۲۹ء سے مطابق ہوتا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ مہینے سردی کے نہیں۔

اِن مثالوں سے یہاں یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ مندرجہ بالا واقعات مروّجہ کلینڈر کے حساب سے درست ہیں، وہیں یہ شبہ بھی ممکن نہیں، کہ عہدِ رسالت میں ہمارا یہ کلینڈر رائج نہ تھا، یا اس کلینڈر کے بموجب واقعات ریکارڈ نہیں کئے گئے، یہ سچ ہے کہ اس سرسری جائزے میں منجملہ بارہ (۱۲) واقعات کے آٹھ واقعے اس کے حساب پر پورے نہیں اُترے لیکن چار (۴) واقعے جو پورے اُترتے ہیں، ان کو کس طرح نظرانداز کیا جاسکتا ہے؟

تیسری قسم کی نامطابقتیں | تیسری قسم ایسے واقعات کی ہے، جن کی توقیتی جانچ عصری تاریخ یا فلکی حسابات سے ممکن ہے۔ ان میں منجملہ پانچ واقعات کے تین (۳) بظاہر غلط اور دو صحیح معلوم ہوتے ہیں۔

(۱) اس سلسلے میں سب سے اہم "صومِ عاشورہ" کی روایتیں ہیں، جو بیشتر حدیث کی کتابوں میں نظر آتی ہیں، سب جانتے ہیں کہ عاشورے کا روزہ دسویں محرّم کو مسنون ہے، اور آنحضرتؐ ہمیشہ اسی تاریخ کو یہ روزہ رکھا کرتے تھے۔

احادیثِ صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب پیغمبرِ اسلامؐ مدینے پہنچے تو ایک دن آپؐ نے دیکھا، کہ مدینے کے یہودیوں میں" صومِ عاشورہ "کی رسم منائی جارہی ہے، اس پر آپؐ نے خود بھی روزہ رکھا اور جملہ مسلمانوں کو اس کی تاکید فرمائی[2]، اس دن سے یہ سُنّت عام ہوگئی اور آج تک چلی آرہی ہے، ہر سال بہت سے مسلمان دسویں محرّم کو یہ روزہ رکھ رہے ہیں۔

یہودیوں میں یہ روزہ ماہِ تِشری کی ۱۰ / تاریخ کو رکھا جاتا تھا، جو اُن کے مذہبی سال کا ساتواں مہینہ تھا[3] اس اعتبار سے اصولاً اس سال عربی ماہِ محرم اور یہودی ماہ تشری کو بالکل متوازی ہونا چاہیے۔ تاکہ دونوں مہینوں کی دسویں تاریخ ایک ہی دن پڑے، مگر تعجب ہے کہ تقویمی حسابات کی روشنی

[1] طبری ۳/۱۱۰ [2] بخاری عاشورہ [3] BIBLE DISTRESSING FEAST

میں ہماری روایتیں صحیح ثابت نہیں ہوتیں" "البیرونی" نے بڑی شرح وبسط کے ساتھ ان روایات پر تنقید کی ہے۔ اور ثابت کیا ہے کہ "یہ جملہ روایات از روئے حساب غلط' اور بالکل بے اصل ہیں" میں یہاں اس کی اصل عبارت پیش کرتا ہوں۔

"لوگوں میں یہ روایت بھی مشہور ہے کہ رسول اللہ ؐ نے مدینہ پہنچ کر یہودیوں کو عاشورے کا روزہ رکھتے دیکھا، جب آپ نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس روز خدا نے فرعون کو غرق اور حضرت موسیٰ ؑ اور بنی اسرائیل کو نجات دی تھی، یہ سُن کر آنحضرت ؐ نے فرمایا "کہ یہودیوں کے مقابلے میں ہم موسیٰ ؑ سے زیادہ قریب ہیں" چنانچہ اسی روز آپ ؐ نے روزہ رکھا، اور صحابہ کو بھی تاکید کی کہ وہ یہ روزہ رکھیں، جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو عاشورے کے روزے کا نہ آپ ؐ نے حکم دیا نہ ممانعت کی۔"

"علمی تحقیقات سے یہ روایت ثابت نہیں ہوتی، کیوں کہ جس سال ہجرت ہوئی اس کے محرم کی پہلی تاریخ کو جمعے کا دن اور ۱۶ر تموز ۹۳۲ ؁ سکندری تھی، لیکن اس روز کا یہودی تقویم سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سال کا پہلا دن یکشنبہ ۱۲ر ایلول مطابق ۲۹ر صفر تھا، لہٰذا عاشورے کا روزہ سہ شنبہ ۹ر ربیع الاول کو ہونا چاہئے اور آنحضرت ؐ کی ہجرت ربیع الاول کے نصف اول میں ہوئی تھی"[1]

اس کے بعد آگے چل کر لکھتا ہے:-

"اور عاشورہ کسی طرح محرم میں واقع نہیں ہوا (کیوں کہ از روئے حساب) ہجرت سے دس اور بیس سال پہلے اور بیس اور تیس سال بعد ایسا ہو سکتا ہے، اس لئے یہ دعویٰ بالکل غلط ہے کہ رسول اللہ ؐ نے عاشورے کے دن اس بنیاد پر روزہ رکھا تھا کہ وہ اس سال (قمری) کے پہلے مہینے (محرّم) کی دسؔ تاریخ تھی، اور دونوں تاریخیں یعنی دسویں تشری اور دسؔ محرم ایک دن واقع ہوئی تھیں"[2]

---

[1] آثار الباقیہ (سخاؤ) ۳۲۷/ THE CHRONOLOGY OF ANCIENT, NATIONS C. E. SACHAU P327

[2] ایضاً۔

ظاہر ہے کہ اگر البیرونی کا یہ حسابی اعتراض صحیح ہے تو روایاتِ عاشورہ کی کوئی قیمت نہیں رہتی اور کتبِ حدیث کا کم سے کم ایک باب بند ہو جاتا ہے۔

(۲) یہ روایتیں سنہ ۱ھ یا سنہ ۲ھ سے متعلق تھیں اور حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں، اب سنہ ۶ھ کی ایک اور روایت پر غور فرمایئے جو سیرت کی کتابوں میں ملتی ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرتؐ میدانِ حدیبیہ میں تھے، کہ شاہِ ایران خسرو پرویز کے قتل کی اطلاع پہنچی[1]، بلکہ بعض روایات میں تو یہاں تک ہے کہ یہ اطلاع تاریخ دیوم کی صراحت کے ساتھ بذریعہ وحی آئی تھی[2] اور بتایا گیا تھا کہ کسریٰ کو اس کے بیٹے شیرویہ نے سہ شنبہ ۱۰ جمادی سنہ ۷ھ کو قتل کر دیا، اسی روایت میں سنہ ۷ھ تو بالبداہت سہو کتابت معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ عمرۂ حدیبیہ متفقہ طور پر سنہ ۶ھ کا واقعہ ہے، تاہم کئی اور غلطیاں بھی نظر آتی ہیں جو قابلِ گرفت ہیں، مثلاً:-

(الف) اگر سنہ ۷ھ کے بجائے سنہ ۶ھ بھی مان لیا جائے تو اس سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ آنحضرتؐ تک اس قتل کی اطلاع کم سے کم چھ ماہ بعد پہنچی، کیوں کہ حدیبیہ ذیقعدہ سنہ ۶ھ کا واقعہ ہے۔ اور یہ جمادی الاولیٰ کا۔

(ب) سنہ ۶ھ اور سنہ ۷ھ دونوں میں تاریخ و ایام کی مطابقتیں مفقود ہیں (جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے)

(ج) سب سے بڑھ کر یہ کہ کسریٰ کے قتل کی تاریخ یورپی مورخوں[3] کے یہاں بھی محفوظ ہے جس کی رو سے یہ واقعہ ۲۷ یا ۲۹ فروری سنہ ۶۲۸ء کا قرار پاتا ہے، اس کے مقابلے میں جمادی الاولیٰ سنہ ۶ھ ۱۸ ستمبر سنہ ۶۲۷ء سے مطابق ہوتا ہے اور سنہ ۷ھ میں جمادی الاولیٰ ۶ ستمبر سنہ ۶۲۸ء کو شروع ہوا تھا۔

چنانچہ ڈاکٹر حمید اللہ نے پوری متانت سے اس روایت کی تغلیط کی ہے[4]۔ واقعات کو پرانے مزعومات کے تحت سوچا ورنہ اس تغلیط کی نوبت نہ آتی۔

(۳) اسی طرح آنحضرتؐ کے صاحبزادے ابراہیم کی تاریخِ رحلت حسابی قاعدوں سے بالبداہت غلط ثابت ہوتی ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی رحلت کا واقعہ ربیع الاول یا ربیع الآخر سنہ ۱۰ھ کا ہے، روایات سے معلوم

---

[1] طبری ۲/۱۴۳۳ [2] ابن خلدون ۲/۳۸ - نیز دیکھیے طبری ۳/۹۱
[3] E. G: BBON - DECLINE - VOL iii P. 315 نیز دیکھیے روداد معارفِ اسلامیہ اجلاس دوم سنہ ۳۲ء انگریزی حصہ
[4] معارف سنہ ۴۴ء۔

ہوتا ہے کہ ان کی پیدائش ذوالحجہ ۸ھ[1] میں کسی تاریخ کو ہوئی تھی، صحاح کی ایک روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سترہ یا اٹھارہ مہینے زندہ رہے[2] اس حساب سے متذکرہ بالا تاریخ بظاہر صحیح اور قابلِ اعتماد نظر آتی ہے، مگر اس کے ساتھ ہی یہ روایتیں بھی ملتی ہیں، کہ جس روز ان کا انتقال ہوا تھا، اسی روز سورج کو گہن لگا تھا جس پر آنحضرتؐ کو ایک یادگار خطبہ دینا پڑا۔[3]

از روئے حساب ہیئت یہ سورج گرہن ۲۷ جنوری ۶۳۲ء کو ہوا تھا[4] جس کا متوازی ہجری مہینہ شوال ۱۰ھ آتا ہے، گویا یہ واقعہ ۲۹ شوال کا تھا، اس طرح ظاہر ہے کہ ربیع الاول یا ربیع الآخر کی روایات کو صحیح نہیں کہا جاسکتا۔

متذکرہ بالا تینوں مثالوں سے بظاہر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ روایات سیرت کی جانچ اگر دوسرے علمی ذرائع سے کی جاتی ہے تو یہ اس کسوٹی پر پوری نہیں اترتیں، مگر میرے نزدیک یہ خیال غلط ہے، اور کتبِ سیرت میں ایسی روایتیں بھی موجود ہیں جن کو علمِ ہیئت اور عصری تاریخ کی پوری تائید حاصل ہے، میں یہاں دو مثالیں پیش کرتا ہوں،

صحیح توقیت کی مثالیں | (۱) بیان کیا جاتا ہے کہ جمادی الآخریٰ ۵ھ میں ایک چاند گرہن ہوا تو مدینے کے یہودیوں نے تھالیاں بجانا شروع کیں[5] ان کا خیال تھا، کہ چاند پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔

از روئے ہیئت یہ چاند گرہن ۹ نومبر ۶۲۶ء کو ہوا تھا، جو ۱۴ جمادی الآخریٰ ۵ھ سے مطابق ہوتا ہے[6] اس وقت بنو قریظہ کے یہودی مدینہ میں موجود تھے۔

(۲) اسی طرح اہلِ سیر کا متفقہ بیان ہے کہ حدیبیہ کے فوراً بعد ذوالحجہ ۶ھ (مطابق اپریل مئی ۶۲۸ء) میں آنحضرتؐ نے قیصر و کسریٰ کے پاس سفارتیں روانہ کی تھیں[7] ان میں قیصر کو جو سفارت بھیجی گئی تھی، اس کی تاریخ یونانی مصنفین کے یہاں محفوظ ہے، مارگولیتھ Margoliouth کہتے ہیں۔ کہ "عرب اور یونانی مصنفین کے نزدیک اس سفارت کی تاریخ متفق علیہ ہے اور یہ قصہ خواہ غلط ہی کیوں

---

[1] ابن سعد ۱/۱۹ [2] دیکھئے بخاری، نیز دیکھئے دیار بکری ۱۴۶/۲ [3] MARGOLIOUTH RISO P XX
[4] MUIR Life 430 [5] دیار بکری ۱/۴۶۹ [6] التنبیہ والاشراف/۲۴۴ [7] دیار بکری ۲/۲۹ ابن سعد ۲/

نہ ہو مگر اس میں توقیتی (chronological) غلطی نہیں [1]"

بعض قدیم یورپی مؤرخین نے یہ تاریخ اپریل ۶۲۸ء متعین کی ہے جو سیرت نگاروں کی تاریخ یعنی ذوالحجہ ۶ھ سے عین مطابق ہے، کیوں کہ ہجری تقویم کے بموجب ذوالحجہ ۶ھ سہ شنبہ ۱۲ر اپریل کو شروع ہوا تھا،

اِن مثالوں سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ کتب سیرت میں ایسی روایتیں بھی موجود ہیں جن کی تصدیق موجودہ علمی ذرائع بھی کرتے ہیں، اور اگرچہ بظاہر ان کتابوں میں قدم قدم پر تقویمی اغلاط اور تضاد نظر آتے ہیں، لیکن ان کا ایک حصّہ پھر بھی نقّادانِ فن کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے، کہ دوسرے حصّہ کے تقویمی اغلاط اور تضادات کی بنیادی اور مادّی وجہ کیا ہے؟ اور اس میں مدونین سیرۃ کی بے احتیاطی یا روایتی بھول چوک کو دخل ہے، یا کوئی اور بات ہے؟

توقیتی تضادات کی چوتھی قسم اب میں قارئین کے سامنے سیرت کے توقیتی تضادات کی چوتھی قسم پیش کرتا ہوں، جو سب سے زیادہ واضح اور ایک عرصۂ دراز سے معرضِ بحث میں آچکی ہے، مگر اس کا حل علمائے اسلام کی سمجھ میں بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ ایک روایت کو کسی نہ کسی طرح ترجیح دیدی جائے۔ اور دوسری کو راوی کی بھول یا مختصر لفظوں میں کذب پر محمول کر کے رد کر دیا جائے۔

آپ جانتے ہیں کہ قدیم کتب سیرت میں اکثر واقعات کے متعلق دو مختلف مہینوں کے نام ملتے ہیں مثلاً:- (۱) ایک مصنف (ابن اسحٰق نے) "بدرِ اولیٰ" یا غزوہ کُرز بن جابر فہری کی تاریخ جمادی الاخریٰ ۲ھ بیان کی ہے[2]۔ تو دوسرے مؤرّخ (واقدی) نے یہی واقعہ ربیع الاوّل ۲ھ کا قرار دیا ہے[3]۔

اس قسم کی بہت سی مثالیں کتبِ سیرت میں موجود ہیں، اور خاص طور پر ابن اسحٰق اور واقدی کے درمیان ایسے اختلافات اور تضادات سب سے زیادہ نمایاں ہیں، جس کی وجہ سے شروع ہی میں تاریخ کے کم سے کم دو مکاتبِ خیال پیدا ہو گئے تھے، چنانچہ کئی مشہور مصنفین اگر ابن اسحٰق کے ساتھ ہیں، تو اسی درجے اور مرتبے کے متعدد علمائے تاریخ واقدی کے ہم نوا ہیں، بہر صورت ان تضادات کی صحیح نوعیت

---

[1] MARGOLIOUTH RISE P. 365 [2] ابن ہشام ۲/۲۵۱ [3] واقدی ۳/ ابن سعد ۲/۴

سمجھنے کے لئے اور مثالیں ملاحظہ فرمائیے:-

(۲) ابن اسحٰق کے بیان کے بموجب آنحضرتؐ جب بدر سے مدینے واپس تشریف لے آئے تو سات آٹھ دن کے اندر ہی، بنو سلیم کی جنگی تیاریوں کی اطلاع ملی، جس پر آپؐ نے فوراً ہی دیارِ بنو سلیم کی طرف کوچ کر دیا،[1] طبری اور ابن حبیب نے جو ابن اسحٰق کے مکتبِ خیال کے مصنفین ہیں، اس غزوے کی تاریخ شوال سنہ ۲ھ بیان کی ہے،[2] جن کے تتبع میں ابنِ خلدون وغیرہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے،[3] بخلاف اس کے واقدی اور ابن سعد وغیرہ کے نزدیک یہ واقعہ محرم سنہ ۳ھ کا ہے،[4] چنانچہ مقدسی[5] اور مسعودی[6] وغیرہ کی مہریں اسی تاریخ پر ثبت ہیں، اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ ابن اسحٰق کے مکتبِ خیال کے نزدیک یہ واقعہ غزوۂ سویق (ذوالحجہ سنہ ۲ھ) سے بہت پہلے کا ہے، اور واقدی کے مکتب تاریخ کی رائے میں غزوۂ سویق کے بعد کا۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے اختلافات کا سب سے نمایاں اثر واقعاتی ترتیب اور اس کے ساتھ ہی اسباب و علل پر پڑتا ہے، چنانچہ قرنِ وسطیٰ کی تقریباً تمام کتابیں اسی قسم کے اختلافات سے حد درجہ متاثر ہیں۔

(۳) ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے:-

سیرت کی کتابوں میں ایک واقعہ "غزوۂ ذی امر" کے نام سے موسوم ہے، ابن اسحٰق کی روایت سے معلوم ہوتا ہے، کہ یہ مہم ذوالحجہ سنہ ۲ھ کی آخری تاریخوں میں شروع ہوئی تھی[7] اس کے مقابلے میں واقدی نے اس کی تاریخ ربیع الاول سنہ ۳ھ بیان کی ہے[8] ابنِ کثیر نے اِن دونوں بیانات کو اکٹھا کر دیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:-

"ابنِ اسحٰق کا بیان ہے کہ جب رسول اللہؐ غزوۂ سویق سے واپس ہوئے تو مدینے میں ذوالحجہ کا بقیہ مہینہ یا اس کے لگ بھگ قیام کیا، اس کے بعد نجد پر غطفان کے ارادے سے لشکر کشی کی

---

[1] ابن ہشام ۳/۴۶، [2] طبری ۲/۲۹۸- ابن حبیب/۱۱۱ [3] ابن خلدون ۲/۲۱ [4] واقدی/۱۸۳ ابن سعد ۲/۲۱ [5] مقدسی/۱۹۷ [6] التنبیہ والاشراف/۲۴۳ [7] ابن ہشام ۳/۴۸، ۴۹، نیز دیکھئے طبری ۲/۲۹۹ - ابن خلدون ۲/۲۲ (ابن خلدون نے محرم کی تاریخ بیان کی ہے)

[8] واقدی/۱۹۲، ابن سعد ۲/۲۳۰ مقدسی ۴/۱۹۷-

اور یہی غزوۂ ذی امر ہے اور واقدی کا قول ہے کہ آنحضرتؐ کو اطلاع ملی کہ ذی امر میں غطفان کی ایک جماعت جو بنی ثعلبہ بن محارب کی شاخ ہے جمع ہوئی ہے اور اس کا ارادہ تخریب کا ہے۔ تو آپ مدینے سے پنجشنبہ کے دن ۱۲ ربیع الاول کو نکلے"[1]

گویا ابن اسحٰق اور واقدی کی تاریخوں میں تقریباً ڈھائی تین مہینے کا فرق ہے، جو توقیتی اعتبار سے کم نہیں، یہی دو ڈھائی مہینے کا فرق ایک اور مثال سے واضح ہوتا ہے،

(۴) ابنِ اسحٰق نے سریہ زید بن حارثہ کا تذکرہ کرتے ہوئے جو قردہ کی طرف روانہ کیا گیا تھا۔ (اور جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے) بیان کیا ہے کہ یہ واقعہ غزوۂ بدر سے چھ[2] ماہ بعد کا ہے۔[3] جس کے حساب سے اس کی تاریخ ربیع الاول سنہ ۳ھ متعین ہوتی ہے، لیکن واقدی نے صراحت کی ہے کہ یہ سریہ جمادی الاولیٰ سنہ ۳ھ[3] میں روانہ کیا گیا تھا، گویا وہی دو ڈھائی مہینے کا فرق یہاں بھی نظر آرہا ہے۔ اور تقریباً یہی فرق غزوۂ بدر موعد کی توقیتی صراحتوں میں ہے۔

(۵) ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ آنحضرتؐ شعبان سنہ ۴ھ میں پوری تیاری[4] سے اسی غزوے کے لئے نکلے تھے، مگر واقدی کے نزدیک یہ واقعہ ذیقعدہ سنہ ۵ھ[5] کا ہے، تاہم اسی سنہ کے ایک واقعہ میں توقیتی اختلاف نسبتاً بہت طویل ہے،

(۶) ابن اسحٰق نے غزوۂ بدر موعد سے پہلے اور غزوۂ بنو نضیر کے بعد جمادی سنہ ۴ھ میں ایک اور غزوے کا تذکرہ کیا ہے جو ذوامر کی طرح غطفان اور ثعلبہ کے خلاف اقدام تھا، مغازی کی اصطلاح میں اس کو غزوۂ ذات الرقاع[6] کہا جاتا ہے، لیکن واقدی کے نزدیک یہ واقعہ محرم سنہ ۵ھ کا[7] ہے، یعنی ابن اسحٰق اور واقدی کی توقیت میں تقریباً آٹھ ماہ کا فرق ہے،

(۷) سنہ ۷ھ میں بھی یہ فرق نمایاں ہے، چنانچہ ابنِ اسحٰق نے غزوۂ خیبر کی تاریخ محرم سنہ ۷ھ بیان

---

[1] البدایہ والنہایہ ۴/۲ نیز دیکھئے دیار بکری ۲۱۴/۱ [2] البدایہ ۴/۴ [3] واقدی/ ۱۹۵ نیز دیکھئے ابن سعد ۲/۲۴ مقدسی ۴/۱۹۸ [4] ابن ہشام ۳/ ۲۲۰، نیز دیکھئے طبری ۳/ ۴۱ ابن سید الناس/ ۵۳ [5] واقدی/ ابن سعد ۲/ ۴۲ [6] ابن ہشام ۳/ ۲۴۳ نیز دیکھئے ابن سید الناس ۲/ ۵۲ [7] واقدی/ ۴ ابن سعد ۲/

کی ہے[1]، مگر واقدی کے نزدیک اس کی صحیح تاریخ جمادی الاولیٰ[2] سنہ ۲ھ ہے یعنی تقریباً چار ماہ کا فرق،

اس قسم کے توقیتی اختلافات اگرچہ ابن اسحٰق اور واقدی کی روایات میں زیادہ ہیں تاہم دوسرے مؤرخین بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، اور متعدد اکابر کی روایتیں آپس میں متصادم ہیں، میں یہاں ان کے بھی دو ایک نمونے پیش کرتا ہوں،

(۸) تحویلِ قبلہ کے متعلق عام روایت یہ ہے کہ یہ شعبان[3] سنہ ۲ھ کا واقعہ تھا، مگر امام زہری کی ایک روایت سے پتہ چلتا ہے کہ قبلے کی تبدیلی جمادی سنہ ۲ھ[4] میں ہوئی تھی۔

(۹) اسی سلسلے میں سب سے زیادہ دلچسپ روایتی اختلاف معرکۂ اُحد کی توقیت کے سلسلے میں ہے، نہ صرف ابن اسحٰق اور واقدی بلکہ جملہ مؤرخینِ اسلام کا سو فی صدی اتفاق ہے کہ معرکۂ احد کا تعلق شوال سنہ ۳ھ سے تھا۔

واقدی نے ابن اسحٰق کی طرح پوری آب و تاب اور بڑی صراحت سے اس واقعہ کو شوال سنہ ۳ھ ہی کے ذیل میں بیان کیا ہے، لیکن بیان کرتے کرتے ایک روایت ایسی بھی لکھ گئے ہیں، جس سے دھوکا ہونے لگتا ہے کہ کہیں نگاہوں کی شہادت تو غلط نہیں، یہ روایت عبدالحمید بن جعفر کی ہے، جو انھوں نے اپنے والد سے نقل کی تھی، اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ اُحد (شوال کا نہیں) بلکہ محرم سنہ ۳ھ کا واقعہ تھا[5]

کتبِ سیرت میں اس نمونے کی اور بھی کئی روایتیں ہیں، تاہم میں ایک مثال اور پیش کر کے قارئین کی توجہ پانچویں قسم کے تضادات کی طرف منعطف کروں گا۔

(۱۰) سنہ ۶ھ کا ایک واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ عُرینہ کے کچھ لوگ آنحضرتؐ کے مہمان تھے، مگر کچھ عرصہ بعد انھیں مہمانوں نے میزبان کی اونٹنیاں چرائیں اور بھاگ نکلے، جس پر کرز بن جابر فہری کو اُن کے تعاقب میں بھیجا گیا، اس واقعہ کی تاریخ قسطلانی کی زبان سے سُنیے وہ کہتے ہیں:-

---

[1] ابن ہشام ۲/-　[2] واقدی /۲

[3] طبری ۲/۲۶۵　مقدسی ۴/۱۸۴، تلقیح ابن جوزی /۲۰

[4] عیون الاثر ۲/۲۳۱　[5] واقدی /۳۱۷، ۳۱۸

"یہ واقعہ جمادی الاخریٰ سنہ ۶ھ کا ہے، اور بخاری نے اس کا تذکرہ حدیبیہ کے بعد کیا ہے، جو ذیقعدہ کا واقعہ تھا، اور واقدی کے نزدیک یہ شوال میں ہوا، جس سے ابنِ سعد اور ابن حبان بھی متفق ہیں"[1]

امثلہ بالا سے بظاہر یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ کتبِ سیر میں واقعاتی ترتیب تو کجا صحیح مہینے بھی متعین نہیں، تاہم واقعاتی ترتیب کے سلسلے میں کچھ بعض دل چسپ نمونے ملاحظہ فرمائیے جو خود قدماء کے لئے باعثِ حیرانی رہے،

واقعاتی ترتیب میں تضاد (۱) ابن اسحٰق اور واقدی دونوں اساطین سیرۃ نے سلسلۂ غزوات کی ابتدا "غزوۂ ابواء" سے کی ہے، جو متفقہ طور پر صفر سنہ ۲ھ کا واقعہ ہے[2] لیکن امام بخاری نے اپنی کتاب "المغازی" کی ابتدا میں زید بن ارقم کی ایک روایت بیان کی ہے، جس کا ماحصل یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی بالکل ابتدائی مہم غزوۂ ذات العشیرہ تھی۔

امام بخاری نے یہ روایت نقل تو کردی، لیکن شروع ہی میں ایک نوٹ لگانا پڑا کہ ابن اسحاق کی رائے میں "غزوہ ابوا" پہلا غزوہ ہے[3] اسی طرح واقدی نے بھی سلسلۂ غزوات کی ابتدا اگرچہ "غزوۂ ابوا" ہی سے کی ہے، لیکن ان کو یہ صراحت کرنا پڑی کہ زید بن ارقم کی روایت کے بموجب غزوۂ ذات العشیرہ پہلا غزوہ ہے۔[4]

(۲) اسی سلسلے میں سب سے زیادہ حیران کُن مثال "غزوۂ تبوک" اور حج ابوبکرؓ کی ہے جو دونوں سنہ ۹ھ کے واقعات ہیں، علمائے سیر کا اتفاق ہے، کہ غزوۂ تبوک رجب سنہ ۹ھ کا واقعہ ہے[5]، اور حجِ ابوبکر ذوالحجہ سنہ ۹ھ، لیکن عروہ بن زبیر جو سیرۃ کے سلسلے میں سب سے بڑی سند سمجھے جاتے ہیں، کہتے ہیں کہ "جب حضرت ابوبکر حج سے فارغ ہو کر مدینے پہنچے تو آنحضرت "غزوۂ تبوک" کے لئے نکلے گویا[6] "غزوۂ تبوک" ذی قعدہ سنہ ۹ھ کے بعد کا واقعہ ہے۔

یہ ہیں نمونے ان تقویمی اشکال اور توقیتی تضادات کے جن کے باعث واقعات سیرت کی بہت سی

---

[1] مواہب ۱۶۰/۱، البدایہ ۱۹۹/۴ نیز دیکھئے دیار بکری ۱۰/۲ [2] ابن ہشام ۲۹۰/۲، واقدی ۳/
[3] دیکھئے بخاری کتاب المغازی [4] دیکھئے واقدی ۴/ [5] ابن حبیب ۱۱۵/ [6] الدر المنثور ۱۰۸/۴۔

تفصیلات واقعی ایک معمہ بن گئی ہیں اور میں حیران ہی نہیں بلکہ واقعی مجھے شکوہ ہے کہ مسلمان مصنفین نے اب تک اس طرف کیوں پوری توجہ نہیں کی، کیوں کہ میری رائے میں یہ توقیتی صراحتیں جو بظاہر غلط نظر آرہی ہیں، کسی طرح جعلی یا فرضی نہیں بلکہ حقیقت کی نظر سے دیکھئے تو یہ غلطیاں ہی خود اس بات کی سب سے بڑی ضمانت ہیں کہ مدوّنین سیرت نے انتہائی دیانت داری کا ثبوت دیا ہے۔ اور بلا اس بات کا لحاظ کئے کہ یہ روایتیں بادی النظر میں صحیح ہیں یا غلط ان کو درج واقعات کرنے میں گریز نہیں کیا اور قدیم ریکارڈوں میں جو کچھ بھی ملا سپردِ قلم کردیا۔

علمائے مغرب نے اس معمے کو حل کرنے کی واقعی طرح طرح کی کوششیں کیں، مگر تعجب ہوتا ہے کہ جو لوگ پیکانی اور مصری خطوط کو پڑھنے میں کامیاب ہو سکتے تھے، وہ اس سلسلے میں کیوں ناکام رہے، بہر حال یہ علمائے مغرب ہی تھے، جنھوں نے غالباً سب سے پہلے اِن غلطیوں کو اس بات پر محمول کیا کہ یہ عربوں کے قدیم نظامِ تقویم کا نتیجہ ہیں جس کو مسلمانوں نے ۱۰ھ کے بعد بھلانا شروع کردیا تھا۔

سر ولیم میور (W. MUIR) نے اپنی مشہور کتاب (LIFE OF MOHAMED) کی توقیتی بنیاد پرسیوال (PERCEVAL) کے نظریۂ تقویم پر رکھی ہے، مگر افسوس ہے کہ اس کتاب کا جو ایڈیشن (OUEVOBME) میرے پیشِ نظر ہے، اس میں پرسیوال کے حسابات یا نظریئے کی کوئی تشریح موجود نہیں صرف ایک چھوٹی سی جدول کتاب کے شروع میں دے دی گئی ہے، جس سے صرف یہ اندازہ ہوتا ہے کہ پرسیوال کے نزدیک عہدِ رسالت میں کون سا عربی مہینہ کس جولین مہینے سے مطابق رہتا[1]، تاہم میور کے سرسری بیانات سے معلوم ہوتا ہے (جو شاید پرسیوال ہی سے ماخوذ ہیں کہ اہلِ مکہ کا سنہ ابتداءً خالص قمری تھا، پانچویں صدی کے آغاز میں یہودیانِ عرب کی تقلید کے طور پر اس قمری سنہ کو شمسی سنہ میں (lumi Solar) تبدیل کردیا گیا، اس سلسلے میں جاہلی عربوں کے پیشِ نظر یہ موٹا اصول رہا کہ ہر تیسرے سال ایک ماہ کا اضافہ کردیا جائے جس وقت یہ طریقہ اختیار کیا جارہا تھا، تو یہ لحاظ رکھا گیا تھا کہ ایامِ حج میں حاجیوں اور زائرینِ مکہ کو خوراک کی کمی سے دوچار ہونا نہ پڑے اس لئے زمانۂ حج خریف (AUTEUM) میں مقرر کیا گیا تھا، مگر سالِ شمسی حسابات کے مقابلے میں پھر بھی ایک دن چھوٹا رہا، اس لئے

---

[1] MUIR Life. P. x a

دو۲ سو سال بعد رفتہ رفتہ ایامِ حج بجائے اکتوبر کے مارچ میں آنے لگے تاآنکہ حجۃ الوداع میں آنحضرتؐ نے اس طریقے کو بھی ختم کر دیا۔[1]

پرسیوال کی جدول مطابقت ذیل میں دی جاتی ہے:-[2]

انگریزی مہینے	عربی مہینے
اپریل	محرّم
مئی	صفر
جون	ربیع ۱
جولائی	ربیع ۲
اگست	جمادیٰ ۱
ستمبر	جمادیٰ ۲
اکتوبر	رجب
نومبر	شعبان
دسمبر	رمضان
جنوری	شوال
فروری	ذیقعدہ
مارچ	ذوالحجہ

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ عہدِ رسالت میں کی سنہ قمری شمسی (Luni Solar) تھا۔ قطعی طور پر درست اور ایک تاریخی حقیقت ہے، جس سے انکار ممکن نہیں، مگر میور یا پرسیوال کا یہ تصوّر کہ عربوں نے یہ طریقہ یہودیوں سے حاصل کیا تھا؛ یا ان کے حسابات میں کوئی خاص کوتاہی تھی، صحیح نہیں، بلکہ

[1] MUIR Life P. C ii [2] MUIR Life P. X -

میرے خیال میں ان علماء کے تصور کی اسی غلطی نے اُن کو صحیح نتائج پر پہنچنے سے روک دیا (جیسا کہ آپ آیندہ محسوس کریں گے) یہاں یہ سمجھ لیجئے کہ پرسیوال کے حسابات بنیادی طور پر غلط ہیں اور اس درجہ غلط ہیں کہ اس قسم کی غلطیاں کم سے کم علمائے مغرب سے کمتر ہوتی ہیں،

اس نظریے سے صرف ہجرت اور غزوۂ بدر وغیرہ کے کچھ ایام و تاریخ بظاہر درست معلوم ہونے لگتے ہیں یعنی ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱ھ کو دوشنبے ہی کا دن پڑتا ہے، جو تاریخ ہجرت ہے، اسی طرح غزوۂ بدر کی تاریخ یعنی ۱۷ رمضان سنہ ۲ھ کو جمعہ ہی آتا ہے، مگر ان دو ایک تاریخوں کی ظاہری مطابقت سے، اصل مسئلہ حل نہیں ہوتا، بلکہ اور اُلجھ جاتا ہے، اور اگر سرسری نظر سے بھی دیکھا جائے تو واقعات کہیں سے کہیں جا پہنچتے ہیں، خاص طور پر موسمی تصریحات میں اس درجہ بعد ہو جاتا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے اور شبہ ہونے لگتا ہے کہ ان علماء نے کتب سیرت کا بغائر نظر مطالعہ بھی کیا تھا یا نہیں؟

پرسیوال اور میور کے نظریئے میں کئی خامیاں ہیں، اول تو یہی کہ اگر (بحث کی خاطر) اس کو قبول بھی کر لیا جائے اور یہ فرض کر لیا جائے کہ عہدِ رسالت میں یہی ایک کلینڈر تھا، جیسا کہ "میور" کا خیال ہے، تو جن واقعات کی توقیتی تصدیق ہمارا موجودہ کلینڈر کر چکا ہے، سب کے سب غلط ہو جائیں گے۔ اور تقریباً ایک تہائی (⅓) واقعات کی صحیح تاریخوں سے ہاتھ دھونا پڑے گا، اس نقصان کو برداشت کیا جا سکتا تھا، بشرطیکہ بقیہ دو تہائی (⅔) واقعات کی توقیتی صراحتیں درست ہو جاتیں، مگر یہاں کیفیت یہ ہے کہ دو ایک تاریخوں کے علاوہ جو محض اتفاقی طور پر بظاہر درست نظر آتی ہیں، سب کی سب غلط ہیں، ان اغلاط کی بھی کچھ نہ کچھ توجیہ کر لی جاتی، بشرطیکہ واقعاتِ سیرت کی موسمی اور فلکی تصریحات کے تضاد ختم ہوتے نظر آتے جو حقیقتاً کتبِ سیرت کا سب سے کمزور پہلو اور تاریخی نقطۂ نظر سے سب سے بڑا عیب معلوم ہوتے ہیں،

مجھے واقعی تعجب ہے کہ "میور" جیسے متبحر عالم اور نقاد نے اس ناکارہ تقویم کو بلا پرکھے کس طرح قبول کر لیا اور صرف قبول ہی نہیں کیا، بلکہ اپنی اعلیٰ تصنیف کی بنیاد بھی اسی پر ڈال دی جو توقیتی اعتبار سے اس درجہ گمراہ کن ہے، کہ واقعاتِ سیرت کے موسم بالکل اُلٹے ہو جاتے ہیں، اور جو واقعہ گرما کا تھا، وہ ٹھیک ٹھیک سرما میں پہنچ جاتا ہے، یہاں اس کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) سب سے پہلے واقعۂ ہجرت کو لیجئے، جس کی تاریخ و یوم کی صراحت دوشنبہ ۱۲ ربیع الاول[1] اس تقویم کے حساب سے صحیح بیٹھتی ہے، اور اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے، کہ پرسیوال کا حساب غلط نہیں، مگر اس کو کیا کیجئے کہ یہ ۱۲ ربیع الاول ۲۸ مئی[2] ۶۲۲ء سے مطابق ہوتی ہے، یعنی عین موسم گرما سے، جبکہ خاص طور پر مکہ کا موسم شدید تر ہوتا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ تمام تاریخوں میں یہ روایت متواتر چلی آرہی ہے، اور خود میور نے بھی اس کو پوری آب و تاب سے لکھا ہے کہ ہجرت کی رات میں پیغمبر اسلامؐ نے اپنے بستر پر حضرت علیؓ کو سونے کا حکم دیا تھا، اور اپنی چادر عطا فرمائی تھی، کہ وہ اس کو اوڑھ کر آرام کریں، حالانکہ مکہ کا موسم مئی میں ایسا ہرگز نہیں ہوتا کہ کوئی شخص معمولاً کسی قسم کا کپڑا اوڑھ کر سو سکے، اور وہ بھی بند مکان میں، علاوہ ازیں جب پیغمبر اسلامؐ مدینے پہنچتے ہیں، تو روایتوں میں یہ صراحت ملتی ہے کہ اس وقت فصل خریف سمیٹی جارہی تھی[3] جو مدینے میں عام طور پر آخر ستمبر سے نومبر تک سمٹتی ہے، مئی جون میں اور فصل خریف کا تصور کس درجہ دلچسپ ہے؟

ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے۔

(۲) اوراق گذشتہ میں آپ کسی جگہ پڑھ چکے ہیں، کہ بدر کا موسم روایتی اعتبار سے گرم تھا، اور اتنا گرم تھا کہ مسلمان بارش کی دعائیں کرنے پر مجبور تھے، پھر جب یہ بارش ہوئی تو خود قرآن نے اس کو احسان الٰہی کے طور پر پیش کیا "میور" کی تقویم کے بموجب یہ بارش جنوری کی ایک[4] رات میں ہوئی تھی، اور مسلمانوں کیلئے اس درجہ لذت آفریں تھی، کہ انھیں رات بھر گہری نیند آتی رہی[5]؟

(۳) اسی طرح ابوعفک کے قتل کے واقعے کو "میور" نے فروری ۶۲۳ء[6] کا قرار دیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ روایت بھی نقل کی ہے، کہ جس رات وہ قتل ہوا، مکان سے باہر صحن (COURT YARD[7]) میں سویا تھا۔ مگر فروری کے مہینے میں بوڑھے ابوعفک کا باہر سونا کس درجہ تعجب خیز ہے، خاص طور پر اس صورت میں کہ خود "میور" کی صراحتوں کے بموجب مدینے کا سرمائی موسم انتہائی شدید ہوتا ہے[8]۔

---

[1] MUIR - Life P 168 [2] MUIR Life P 138 [3] بخاری باب ہجرت النبی نیز دیکھئے ابن سعد ۱/۱۶۰
[4] MUIR Life P 222 [5] MUIR Life P 222 [6] MUIR Life 240
[7] MUIR Life P 240 [8] MUIR Life 243 -

(۴) اس سلسلے میں سب سے زیادہ دلچسپ مثال غزوۂ اُحد کی ہے، جس کی تاریخ میور نے جنوری ۶۲۵ء قرار دی ہے، اور اس کے ساتھ ہی تازہ کھجوروں (رطب) (FRESH DATES) کی موجودگی کے واقعات بھی پوری تفصیل سے بیان کئے ہیں[1]۔ جبکہ یہ بات میور کے علم سے باہر نہ ہونا چاہئے کہ مدینے میں تازہ کھجوروں کا موسم آخر جون یا جولائی سے پہلے ممکن نہیں،

اسی طرح تمام واقعات سیرت کے موسم (جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں) اس تقویم کی زد میں آنے کے بعد اُلٹے ہو جاتے ہیں، حتیٰ کہ اس سورج گرہن کی تاریخ جو ۲۸ر جنوری ۶۳۲ء کو ہوا تھا، خود میور نے جون و جولائی ۶۳۱ء[2] قرار دی ہے، جو فلکی حسابات کی روشنی میں قطعاً ممکن نہیں، اس لئے میری رائے میں اس پر مزید تبصرہ غیر ضروری ہے،

معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کی جاہلی تقویم کی بازیافت کے سلسلے میں یہ کوشش بالکل ابتدائی نوعیت کی تھی، اور اس میں زیادہ دقتِ نظر سے واقعات کو نہیں چھانا گیا تھا تاہم علمائے مغرب کی نظر میں یہ مسئلہ ہمیشہ کھٹکتا رہا اور نئے نئے نظریات پیش کئے گئے، جس میں مشہور مستشرق، ولہاوزن (J. WELLHASEN) نے بھی دلچسپی لی، اور انھوں نے متعدد واقعات کی موسمی شہادتوں کو اکٹھا کر کے یہ نتیجہ نکالا کہ "بعض حالتوں میں" اگر ان تاریخی روایتوں کو ڈھائی مہینے آگے بڑھا دیا جائے تو موسموں سے مناسب تطبیق[3] ہو جاتی ہے، یہ خیال اگرچہ کسی قدر صحیح معلوم ہوتا ہے، لیکن صرف "بعض حالتوں" تک محدود ہے، جس سے کوئی حتمی اصول وضع نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ اگر اس کو بطور اصول ہر جگہ استعمال کیا جائے تو بہت سے واقعات زیادہ غلط موسموں میں جا پڑتے ہیں، مثلاً کعب بن اشرف کا قتل دسمبر کا واقعہ قرار دینا پڑے گا، اور غزوۂ خندق مئی جون میں جا پڑے گا۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم نظریہ شاید ونکلر (WINCKLER) نے پیش کیا تھا، جس کی تفصیلات بدقسمتی سے میرے پیشِ نظر نہیں، صرف مارگولیتھ کا یہ بیان ہے کہ:-

"اور ونکلر کی طرف سے یہ بات پیش کی گئی ہے کہ مدینے کی تقویم (CALANDERS) کہتے کی

---

[1] MUIR Life P. 267 [2] MUIR Life P. 429 [3] XX MARGO LIOUTH

تقویم سے غالباً مختلف تھی، دونوں شہروں میں ایک ہی نام کے مہینے اقدارِ زمانی رکھتے تھے، اس کی عربی تقویم کی اصلیت کے متعلق تحقیقاتیں جن کو (NIELSEN) نے اور وسعت دی، ہجرت کے ابتدائی رسالوں کے واقعات کی تاریخیں متعین کرنے میں کوئی عملی اہمیت نہیں رکھتی"

اس بیان سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ونکلر کی رائے میں واقعاتِ سیرت پر دو تقویموں کی کارفرمائی تھی، جو میری رائے میں قطعاً قابلِ قبول ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ مارگولیتھ نے ایسی کوئی تشریح نہیں کی ونکلر کی رائے میں ان دو تقویموں کی ابتدا اور انتہا کس نقطہ سے ہوئی تھی۔ صرف اس قدر بیان کیا ہے کہ

"ونکلر کا نظریہ ہجرت کے ابتدائی سالوں کے واقعات کی تاریخیں متعین کرنے میں کوئی عملی اہمیت نہیں رکھتا" اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس مستشرق کے نظریہ کو قبولِ عام نہ ہو سکا، جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ یہ شاید بعض پیچیدہ حسابات پر مبنی تھا، تاہم مجھے انتہائی ممنونیت سے اس کا اعتراف کرنا ہے کہ میرا دو تقویمی نظریہ ونکلر کے اس تصوّر کا نتیجہ ہے، جس کی اگرچہ ادنیٰ ترین تفصیل بھی میرے پیشِ نظر نہیں، اور ہو سکتا ہے کہ اس مستشرق کے تصوّرات کی گذرگاہ میری تفہیمات سے بالکل جدا ہو، تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ دو تقویمی نظریہ واقعاتِ سیرت کی باقاعدہ جانچ کا منطقی نتیجہ ہے:-

آپ دیکھ چکے ہیں، کہ تقریباً ایک تہائی واقعات سیرت نے جن میں ایام و تواریخ کی تفصیلات بھی شامل ہیں، موسمی صراحتیں بھی موجود ہیں، اور فلکی حسابات کے ساتھ عصری تاریخ کی شہادتیں بھی ملتی ہیں، وسٹنفیلڈ کی عام قمری تقویم سے مطابقت کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ عہدِ رسالت میں کوئی اور کلینڈر موجود ہو یا نہ ہو،

.....And ithos been pointed out by Winckler that the calandar of Medenah maz well have been different from that of Meccah, The Same onths having qnite different values at two cities. His envestigation into the origin of the Arabic calender, Which havbeen amplifide by D. Neelsen are of no practical importance for fixing the dalis of events during the earby years of the Hijrat. (Margolouth' Rise xx)

لیکن ہمارا مروّجہ کلینڈر ضرور رائج تھا، اور اگرچہ اس سے کتنا ہی کم کام لیا جاتا ہو، مگر اس کے وجود سے انکار ممکن نہیں)، اب رہیں دو تہائی واقعات کی توقیتی صراحتیں تو میرے نزدیک یہ مکّی تقویم کے بموجب ریکارڈ کی گئی ہیں جو عہدِ رسالت میں سنہ ۱۰ھ تک رائج رہی۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر حمید اللہ کے ایک قیمتی مقالے کا تذکرہ بھی ضروری ہے جو انھوں نے سنہ ۴۲ء میں عہدِ نبوی کے عربی ایرانی تعلقات کے ذیل میں لکھا تھا، مگر اس میں ضمنی طور پر مکّے کی جاہلی تقویم بھی زیرِ بحث آگئی ہے، اور فاضل مقالہ نگار نے صرف صلح حدیبیہ کے متعلق کچھ تاریخی اختلافات پیش کر کے ان کی توجیہ اصول نسئی کے تحت کرنا چاہی ہے۔

اس مقالے میں انھوں نے ۲ تقویموں کا تصور ایک خاص زاویۂ نگاہ سے پیش کرنے کا اقدام کیا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقالہ محض سرسری طور پر لکھا گیا تھا، اس لئے نتائج قابلِ اطمینان نہ نکل سکے، میں یہاں ان کی جدول تقویم پیش کرتا ہوں جو اگرچہ صرف سنہ ۶ھ سے لے کر سنہ ۱۰ھ تک کی مکّی اور مدنی تقویم کے تطابق کی کوشش پر مبنی ہے لیکن اس کے ذریعہ فاضل مقالہ نگار کا پورا اصولِ تقویم سمجھ میں آسکتا ہے جو میری رائے میں بالکل اُلٹا ہے اور جس پر میں آئندہ تبصرہ کروں گا، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میور کے نظریۂ تقویم کے پہلو میں موجودہ ہجری تقویم کو رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

"جدول"

سنہ ۶ھ				
محرم	ربیع ۱		رجب	رمضان
صفر	ربیع ۲		شعبان	شوّال
ربیع الاوّل	جمادی ۱		رمضان	ذیقعدہ
ربیع الثانی	جمادی ۲		شوّال	ذوالحجہ
جمادی ۱	رجب		ذیقعدہ	×
جمادی ۲	شعبان		ذوالحجۃ	محرّم

سنہ ۷ھ		سنہ ۸ھ		سنہ ۹ھ		سنہ ۱۰ھ	
محرم	صفر	محرم	صفر	محرم	صفر	محرم	محرم
صفر	ربیع ۱	صفر	ربیع الاول	صفر	ربیع الاول	صفر	صفر
ربیع الاول	ربیع ۲	ربیع الاول	ربیع الثانی	ربیع الاول	ربیع الثانی	ربیع الاول	ربیع الاول
ربیع الثانی	جمادیٰ ۱	ربیع الثانی	جمادیٰ ۱	ربیع الثانی	جمادیٰ ۱	ربیع الثانی	ربیع الثانی
جمادیٰ ۱	جمادیٰ ۲	جمادیٰ ۱	جمادیٰ ۲	جمادیٰ ۱	جمادیٰ ۲	جمادیٰ ۱	جمادیٰ ۱
جمادیٰ ۲	رجب	جمادیٰ ۲	رجب	جمادیٰ ۲	رجب	جمادیٰ ۲	جمادیٰ ۲
رجب	شعبان	رجب	شعبان	رجب	شعبان	رجب	رجب
شعبان	رمضان	شعبان	رمضان	شعبان	رمضان	شعبان	شعبان
رمضان	شوال	رمضان	شوال	رمضان	شوال	رمضان	رمضان
شوال	ذیقعدہ	شوال	ذیقعدہ	شوال	ذیقعدہ	شوال	شوال
ذیقعدہ	ذوالحجہ	ذیقعدہ	ذوالحجہ	ذیقعدہ	ذوالحجہ	ذیقعدہ	ذیقعدہ
ذوالحجہ	محرم	ذوالحجہ	محرم	ذوالحجہ	×	ذوالحجہ	ذوالحجہ

اس جدول پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعہ واقعاتِ سیرۃ کی توفیقی تشریحات ممکن نہیں۔

اس سلسلے میں راقم الحروف کے سامنے بھی ایک نظریہ ہے جس کو علمائے تاریخ کے روبرو اس لئے پیش کیا جا رہا ہے کہ ان کے غور و فکر کی کسوٹی پر اُس کی آزمائش ہو سکے، اس نظریہ کا مختصر الفاظ میں خلاصہ یہ ہے:

"ظہورِ اسلام کے وقت جزیرہ نمائے عرب میں کئی تقویمیں رائج تھیں جن میں ایک مکّے میں رائج تھی یہ تقویم قمری شمسی (Luni solar) تھی اور ایک خاص نقطہ فصلی سے شروع ہو کر اسی نقطے پر ختم ہوئی، اس تقویم میں وقتاً فوقتاً مہینے اضافہ ہوتے رہتے، اس کے مقابلہ

میں مدینہ کے اندر ایک دوسری تقویم رائج تھی جو خالص قمری تھی مگر دونوں تقویموں کے مہینے ہم نام تھے، مہاجرین مکہ جب مدینہ پہنچے تو اپنے ساتھ مکی تقویم بھی لے گئے، اس طرح ہجرت کے بعد مدینے میں بیک وقت دو تقویمیں رائج ہو گئیں، جس کے نتیجہ میں بعض لوگوں نے مکی تقویم کے بموجب یادداشتیں مرتب کیں، اور بعض نے مدنی کلینڈر کے مطابق، اس بنا پر ابتدائی مدونین سیرۃ یا ان کے رواۃ کو جو تاریخیں مل سکیں وہ دونوں تقویموں پر مبنی تھیں، ان میں سے مکی تقویم اس وقت ناپید ہے جس کی وجہ سے واقعات سیرۃ کی مکمل توقیتی تشریح ممکن نہیں، اگر مکی تقویم کی بازیافت کر لی جائے تو ہر قسم کی توقیتی الجھنیں ختم ہو جائیں گی۔"

ظاہر ہے کہ اس نظریہ کے تحت ہمیں اوّلاً ظہورِ اسلام کے وقت عربوں کے مختلف توقیتی معیاروں پر ایک سرسری نظر ڈالنا پڑے گی، مگر خاص طور پر مکی نظامِ تقویم کی بازیافت اور مدنی کیلینڈر کی ضروری بناوٹ پر غور کرنا ہوگا، اس کے بعد یہ دیکھنا ہوگا کہ یہ دونوں تقویمیں واقعاتِ سیرۃ پر کس درجہ مؤثر ہیں۔

اس ذیل میں، مجھے افسوس ہے کہ میں مارگولیتھ Margolouth کے اس ہمت شکن خیال سے اتفاق نہیں کر سکتا کہ موجودہ زمانے میں۔

"جاہلی تقویم کا بنانا بہر حال ناممکن ہے جو وسٹنفیلڈ کی پوری تفصیلات کا بدل ہو سکے"[۱]

اس لئے کہ اوّل تو اسلام کی ابتدائی تاریخ بڑی حد تک ہمارے سامنے ہے جس میں جاہلی عہد کے بہت سے اشارے ملتے ہیں، دوسرے خود روایاتِ سیرۃ ہماری رہنمائی کر سکتی ہیں اور صحیح راستہ متعین کرنے میں مدد دے سکتی ہیں، بنا بریں مجھے مایوسی نہیں بلکہ پوری امید ہے کہ مکی نظامِ تقویم کی بازیافت قطعاً ممکن ہے۔

---

[۱] It is not however possibli To make out enough of the pre Islamic calander to Substitute a detailed Scheme for Wüstenfelds. (Margoleath Rise- P. XIX)